تدبّر
لاہور

جاری کردہ:

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

مدیر:

خالد مسعود

یکے از مطبوعات

ادارۂ تدبرِ قرآن و حدیث

لاہور۔ پاکستان

قرآن حکیم

- نفیس کتابت
- سلیس ترجمہ : مولانا امین احسن اصلاحی
- حاشیہ : مشتمل بر اخذ و تلخیص از تفسیر تدبر قرآن خالد مسعود
- سفید زمین اور نیلے حاشیہ کے ساتھ عمدہ طباعت
- خوبصورت جلد اور کور
- سائز 20X30/8 صفحات 1008 قیمت 550 روپے

ناشر: فاران فاؤنڈیشن 122 فیروز پور روڈ لاہور

1- تدبر حدیث — شرح صحیح بخاری (جلد اول)

2- تدبر حدیث — شرح موطا امام مالک (جلد اول)

از

مولانا امین احسن اصلاحی

- ترتیب و تدوین : خالد مسعود، سعید احمد، سید اسحاق علی
- فہم حدیث کا ایک نیا انداز
- خوبصورت طباعت و جلد بندی
- سائز 20X30/8 صفحات 544 , 580
- قیمت: 360 روپے، 350 روپے

ناشر: ادارہ تدبر قرآن و حدیث، رحمان سٹریٹ مسلم روڈ، سمن آباد لاہور

ملنے کا پتہ: دار التذکیر رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

تدبّر
لاہور

جاری کردہ

مولانا امین احسن اصلاحی

مُدیر:

خالد مسعود

شمارہ 79

مارچ 2003ء

محرم 1424ھ

مجلس ادارت

عبداللہ غلام احمد (مدیر مسئول)

محبوب سُبحانی

سعید احمد

سید اسحاق علی

قیمت 12.50 روپے

سالانہ 50.00 روپے

بیرون ملک 250.00 روپے

(ماسوائے برصغیر)

فہرست

تذکرہ و تبصرہ

جنگ عراق کے چند قابل توجہ پہلو — 2
خالد مسعود

تدبر قرآن

تفسیر سورۂ بقرہ (۲) — 4
حمید الدین فراہیؒ / ڈاکٹر عبید اللہ فراہی

تدبر حدیث

درس صحیح بخاری 15
امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی

درس موطا امام مالک 32
امین احسن اصلاحی / ماجد خاور

مقالات

رسول اللہؐ کے فرائض اور ذمہ داریاں — 42
خالد مسعود

مراسلہ و مذاکرہ

نیکی کی راہ میں شیطان کا حملہ — 50
امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی

ناشر: ادارہ تدبر قرآن و حدیث رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہور

E.Mail: Taddabbur@ Hotmail.com

خالد مسعود

جنگ عراق کے چند قابل توجہ پہلو

امریکہ اور برطانیہ کی عراق پر باقاعدہ فوج کشی کو تین ہفتے گزر چکے ہیں۔ عراق کے شہروں پر تابڑ توڑ ہوائی حملے جاری ہیں اور زمینی قبضہ کے لیے گھمسان کی جنگ ہو رہی ہے۔ ہزاروں عراقی ہلاکت خیز بموں کا لقمہ بن چکے ہیں اور ان سے کئی گنا زیادہ گھروں سے محروم ہو چکے ہیں۔ زخمیوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ شہروں کے ہسپتالوں میں ان کے لیے جگہ نہیں رہی اور حملہ آوروں نے کتنے ہسپتالوں کو تاک کر نشانہ بنایا ہے۔ دشمن کے ظلم و تشدد کے باوجود عراقی عوام، افواج اور حکمرانوں نے ان کو یہ موقع نہیں دیا کہ وہ کسی بھی شہر پر اپنا مکمل کنٹرول ثابت کر سکیں۔ دفاعِ وطن کے لیے ان قربانیوں کے لیے وہ نہ صرف عرب اقوام بلکہ امت مسلمہ کی طرف سے داد کے مستحق ہیں۔

امریکہ اپنی تمام تر طاقت و سطوت، اپنی سیاسی قوت اور انتہائی تباہ کن جنگی مشینری کے باوجود اس معرکہ میں بے حد بزدل، گھٹیا حرکتیں کرنے والا، بے اصول، جھوٹا اور بے وفا ملک ثابت ہوا ہے جو اپنی مقصد براری کے لیے ہر اخلاقی حد بندی کو توڑ سکتا ہے۔ چند واقعات اس کے شاہد ہیں:

۱۔ جنگ شروع کرنے سے پہلے امریکہ نے یہ واویلا مچایا کہ عراق کے پاس بڑے پیمانے پر تباہی لانے والے ہتھیار ہیں جن کی تلفی کے لیے اقوام متحدہ کو اسلحہ انسپکٹروں کا ایک بڑا گروپ تشکیل دینا چاہیے۔ اپنے غیر معمولی دبدبہ کے باعث اس نے انسپکٹروں کی بڑی تعداد اس مشن پر عراق بھجوائی جس نے ملک کا چپہ چپہ چھان لیا لیکن اسے کوئی ایسا ذخیرہ نظر نہ آیا جو سادہ دفاعی اسلحہ سے الگ ہوتا۔ بالآخر الصمود میزائلوں کی نشاندہی کی گئی جن کی مار مقررہ فاصلہ سے چند میل زیادہ تھی۔ چنانچہ عراق کا یہ اہم دفاعی ہتھیار تلف کر دیا گیا۔ عراق کے اس اعتراض کو کسی نے نہ سنا کہ انسپکٹروں کے بھیس میں بہت سے امریکی جاسوس جنگی نوعیت کی معلومات جمع کر کے امریکہ تک پہنچا رہے ہیں۔ انسپکٹروں کی اس رپورٹ کے باوجود کہ عراق کے پاس کوئی ہلاکت خیز ہتھیار نہیں، امریکہ اپنی مہم جوئی کی تیاری کرتا رہا تاکہ اس کی بہادر افواج کو ایک نہتے ملک پر حملہ میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

۲۔ صدام حسین کو ذہنی طور پر مرعوب کرنے کے لیے کبھی کہا گیا کہ وہ صدارت چھوڑ دے تو ملک پر حملہ نہیں ہوگا۔ کبھی کہا گیا کہ وہ کسی غیر ملک میں پناہ لے لے تو اس کی جان بخشی ہو سکتی ہے۔ جب اس کے آثار نظر نہیں آئے تو پروپیگنڈا کیا گیا کہ وہ تیل کے کنووں کو آگ لگا دے گا اس لیے ملک کی زمام کار خواہ صدام کے بیٹے اور دوسرے ساتھیوں کے پاس ہو جب بھی حملہ ضرور ہوگا۔ اس دوران میں سلامتی کونسل نے حملہ کی اجازت نہ دی تو اس پر بھی یہ بات واضح کر دی گئی کہ امریکہ کو حملہ کے لیے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس طرح سلامتی کونسل کا وجود ہی خطرے میں ڈال دیا گیا۔

۳۔ امریکی ضد و انانیت اور امن دشمنی کو دیکھتے ہوئے پوری دنیا میں، اور خود لندن اور واشنگٹن میں بہت بڑے مظاہرے ہوئے جن میں امریکہ اور اس کے حلیفوں کی امن دشمن پالیسی سے بیزاری کا اظہار کیا گیا۔ سلامتی کونسل کے باقی ارکان نے امریکی پالیسی کی مخالفت بھی کی لیکن امریکہ نے اپنی ضد نہ چھوڑی اور اپنے سابق حلیف ممالک سے بے نیازی کی روش اختیار کر لی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ان کو دھمکیاں دے کر تعاون پر مجبور کرنے کی کوشش کی گئی۔

۴۔ ۲۰ مارچ کو جب عملاً حملہ شروع کیا گیا تو اس سے پہلے صدام مخالف جذبات کو ابھارنے کے لیے یہ پروپیگنڈا کیا گیا اور اس میں سی این این، بی بی سی اور امریکہ کے کئی ٹیلی ویژنوں نے بھرپور حصہ لیا، کہ عراقی عوام صدام سے بیزار ہیں اور وہ اپنی مدد کو آنے والی افواج کی راہ میں آنکھیں بچھانے کے لیے تیار ہیں۔ عراق کی شیعہ آبادی صدام کے ساتھ اپنے مسلکی اختلاف کے باعث اس سے نالاں ہے اور وہ اس کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ ہے۔ کرد قوم پر صدام نے بڑی زیادتیاں کی ہیں لہٰذا وہ شمالی عراق پر فی الفور قبضہ کر لے گی اور بغداد گھیرے میں آ جائے گا۔ یہ پروپیگنڈا اس شدت سے کیا گیا کہ لوگوں کو بغداد پر امریکہ کا قبضہ دو چار روز کی مار دکھائی دینے لگا۔ حالانکہ نہ کسی شہر میں امریکی فوج کا استقبال ہوا، نہ شیعہ آبادی نے صدام کی حمایت سے ہاتھ کھینچا اور نہ کردوں نے اس موقع پر امریکہ کا ساتھ دیا۔ یہ تمام پروپیگنڈا اقوام عالم اور خود عراقیوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے تھا۔

۵۔ مذکورہ پروپیگنڈا کا پردہ چاک کرنے کے لیے الجزیرہ ٹی وی متحرک ہوا تو اس کی ٹیم پر حملہ کر کے ان کے دفاتر کو تباہ کر دیا گیا، جو برطانوی صحافی نجی رپورٹنگ کر رہے تھے ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ امریکی جرنیل اپنی کامیابیوں کا نیوز کانفرنسوں میں چرچا کرتے رہے لیکن عراقی وزیر سعید الصحاف اس کی تردید ناقابل تردید شہادتوں سے پیش کر دیتے۔ جب امریکہ بغداد پر قبضہ کا اعلان کر رہا تھا، صحافی یہ بیان دے رہے تھے کہ ہم نے بغداد میں کوئی امریکی فوجی نہیں دیکھا۔ صدارتی محل پر شدید ترین حملہ کے بعد امریکہ کے حواری صدام کی ہلاکت کی خبر دے رہے تھے جبکہ دوسرے لوگ اس خبر پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

۶۔ امریکہ کی یہ بے وفائی بھی سامنے آئی کہ جہاں عراقی دفاع مضبوط نظر آیا وہاں برطانوی سپاہیوں کو فرنٹ لائن پر تعینات کر دیا گیا تاکہ نازک طبع امریکیوں کا نقصان نہ ہو۔

۷۔ اس پورے عرصہ میں میدان کارزار میں عراق تنہا اپنی جنگ لڑتا رہا ہے۔ خلیجی کونسل، عرب لیگ اور او آئی سی کے ممالک سے جیسے جرأت، حوصلہ اور عزیمت کی توفیق سلب کر لی گئی ہے کہ وہ اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے عراق کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ سلامتی کونسل کے جن ارکان نے اصول پسندی کا مظاہرہ کیا وہ بھی اب نئے سرے سے امریکہ کی کاسہ لیسی کرتے نظر آ رہے ہیں کیونکہ یہ ان کے مفادات کا تقاضا ہے۔

یہ ہے امریکہ کی بزدلی، بے اصولی، دغابازی اور جھوٹ پر مبنی سیاست کا وہ خاکہ جو جنگ عراق میں سامنے آیا ہے اور اس کا تمام کریڈٹ صدام حسین کی قیادت کو جاتا ہے جس نے امریکی دھمکیوں کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دی اور ان کے آگے فی الفور سر نڈر کر کے اپنے قومی وقار کو داؤ پر نہیں لگایا۔

تدبر قرآن

علامہ حمید الدین فراہی
ترجمہ: ڈاکٹر عبید اللہ فراہی

تفسیر سورۃ البقرۃ

-۳-

۱۲۔ مجموعہ آیات ۱۔۵ میں الفاظ کی ترکیب

الٓمّٓ: یہ ایک مستقل جملہ ہے جس کا مطلب ہے کہ یہ الف لام میم ہے۔ یہ یہاں پر اس طرح آیا ہے جس طرح کتابوں، فصلوں اور ابواب کے شروع میں ان کے نام اور دوسرے عنوانات لگا دیے جاتے ہیں۔ چوں کہ یہ ایک مستقل جملہ ہے اس لیے اس پر وقف کرنا احسن ہے۔ یہی حال ان تمام ناموں کا ہے جو دوسری سورتوں کے شروع میں آئے ہیں جیسا کہ آیت ذیل میں یہ چیز بالکل واضح ہے۔

ن. وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ. (القلم:۱)

﴿یہ سورہ ن ہے۔ شاہد ہے قلم اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں﴾

دوسری جگہ ہے:

ص. وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ. (سورہ ص:۱)

﴿یہ سورہ ص ہے۔ شاہد ہے یاد دہانی کرنے والا قرآن﴾

ایک اور جگہ ہے:

ق وَالْقُرْآنِ الْمَجِيْدِ. (سورہ ق:۱) ﴿یہ سورہ ق ہے۔ شاہد ہے قرآن مجید﴾

نیز فرمایا ہے:

يٰس. وَالْقُرْآنِ الْحَكِيْمِ. (سورہ یٰس:۱۔۲)

﴿یہ سورہ یٰس ہے۔ شاہد ہے قرآن حکیم﴾

ذٰلِكَ الْكِتَابُ میں کتاب کا لفظ 'ذلک' کی خبر ہے۔ یعنی یہ کتاب الٰہی ہے، جیسا کہ نظائر سے اس مفہوم کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ قرآن مجید میں اس کی جتنی نظیریں ہیں سب اسی ترکیب کے ساتھ آئی ہیں۔ جیسے طسٓمٓ. تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِيْنِ (سورہ شعراء:۱۔۲، سورہ قصص:۱۔۲) یہ

طسم ہے۔ یہ کتاب مبین کی آیتیں ہیں۔ اس میں تلک مبتدا ہے اور بعد کی عبارت اس کی خبر ہے۔ اسی کے مثل یہ آیات بھی ہیں۔

طس. تِلْكَ آيَاتُ الْقُرْآنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ. (نمل:۱)

﴿یہ طس ہے۔ یہ قرآن اور کتاب مبین کی آیتیں ہیں﴾

الم. تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيْمِ. (لقمان:۱۔۲)

﴿یہ الم ہے۔ یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں﴾

ان اسماء اشارہ کے بعد جو اسم معرفہ آتا ہے ضروری نہیں کہ وہ بدل اور بیان کے لیے آئے بلکہ کبھی کبھی خبر کے طور پر آتا ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا مثالوں میں آپ نے دیکھا اور یہ کلام عرب میں بھی شائع اور معروف ہے۔ نابغہ کہتا ہے:

و يرجع الى غسان ملك و سودد　　و تلك المنى لو اننا نستطيعها (دیوان نابغہ:۱۰۷)

﴿اور آل غسان کی بادشاہت اور سیادت دوبارہ قائم ہو، یہی آرزو ہے۔ کاش یہ آرزو پوری ہوتی﴾

امیہ ابن ابی الصلت مکارم اخلاق کے ذکر کے بعد کہتا ہے:

تلك المكارم لا قعبان من لبن (شعراء النصرانیہ:۲۳۲)

﴿یہ ہیں شریفانہ کام نہ کہ پانی ملے ہوئے دودھ کے دو پیالے (جو بعد میں پیشاب بن گئے)﴾

اس کی تائید میں کچھ باتیں انشاء اللہ پندرھویں فصل میں آئیں گی۔

لا ريب فيه: "فیہ" میں جو ضمیر ہے وہ یا تو پورے جملہ کی طرف لوٹ رہی ہے یا "ذلک" کی طرف بایں معنی کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ ایک کتاب ہے۔ کیوں کہ شک کی بات کسی چیز کے متعلق خبر دینے ہی کے پہلو سے ہوتی ہے۔ مثلاً فرمایا ہے:

اِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا. (غافر:۵۹)

﴿بے شک قیامت آنے والی ہے، اس بات میں کوئی شک نہیں﴾

یعنی قیامت کے آنے کے سلسلہ میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہی معاملہ اس آیت میں بھی ہے کہ اس کے ایک منزل من اللہ کتاب ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ کیوں کہ یہاں "**الکتب**" سے مراد، جیسا کہ پہلے گزرا، کتاب اللہ ہے۔ **لا ريب فيه** دراصل ایک پورا جملہ ہے جو اپنے ماقبل کی تاکید کے لیے آیا ہے۔ یعنی بتایا جارہا ہے کہ یہ کتاب الٰہی ہے، اس کے کتاب الٰہی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو اسے حال قرار دے لیں کیوں کہ اسماء اشارہ سے بھی حال آتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے:

وَ هٰذَا صِرَاطُ رَبِّکَ مُسْتَقِیْمًا ۔ (انعام:۱۲۶)

﴿اور یہ تیرے رب کی راہ ہے بالکل سیدھی﴾

دوسری صورت یہ ہے کہ اس کو مستقل جملہ معترضہ کے طور پر بھی رکھ سکتے ہیں۔ نتیجہ کے اعتبار سے دونوں باتیں یکساں ہیں۔ فصل چودہ میں کچھ چیزیں اس بات کی تائید میں آئیں گی کہ یہ جملہ تاکید کے لیے آیا ہے۔

ظرف یعنی "فیہ" کا تعلق "لا ریب" سے ہے، نہ کہ "ھدی" سے۔ بعض لوگوں نے لا ریب کی خبر کو محذوف مان کر "فیہ" کو "ھدی" کی خبر مقدم قرار دیا ہے مگر یہ ترکیب لفظی و معنوی دونوں پہلوؤں سے بعید ہے۔ جہاں تک معنوی بُعد کا تعلق ہے ہم اگلے جملہ میں اس پر گفتگو کریں گے۔ رہی لفظی بُعد کی بات تو اس کی وجوہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ حذف خلاف اصل ہے۔

۲۔ اس کے تمام نظائر بغیر حذف کے آئے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں "لا ضیر" اور "لا مساس" تو آیا ہے لیکن پورے قرآن میں کہیں بھی "لا ریب" حذف خبر کے ساتھ نہیں آیا۔

۳۔ حذف کو مقدر ماننے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔

۴۔ سب سے مضبوط دلیل یہ ہے کہ "فیہ ھدی" تاویل کے لحاظ سے صحیح نہیں ہے، جیسا کہ آگے چل کر ہم بتائیں گے۔ ان دلائل کی روشنی میں ضروری ہو جاتا ہے کہ "فیہ" کو "لا ریب" سے متصل مانا جائے۔

ھدی للمتقین: "ھدی" اسم اشارہ سے حال واقع ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ اس کی نظیر میں آیتیں پیش ہیں:۔

الٓمّٓ ۔ تِلْکَ آیَاتُ الْکِتَابِ الْحَکِیْمِ ۔ هُدًی وَّ رَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِیْنَ ۔ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ۔ اُولٰٓئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (لقمان:۱۔۵)

﴿یہ الم ہے۔ یہ پرحکمت کتاب کی آیات ہیں۔ ہدایت و رحمت بن کر نازل ہوئی ہیں حسن عمل والوں کے لیے، جو نماز کا اہتمام کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یہی لوگ یقین رکھتے ہیں۔ یہی اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہوں گے۔﴾

دوسری جگہ ہے:

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِکِتَابٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰی عِلْمٍ هُدًی وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۔ (اعراف:۵۲)

﴿اور ہم نے ان کو ایک ایسی کتاب پہنچادی ہے جس کی تفصیل ہم نے علم قطعی کی بنیاد پر کی ہے، ہدایت و رحمت بنا کر ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔﴾

ایک اور جگہ آیا ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَ الْفُرْقَانِ ۔ (بقرہ:۱۸۵)

﴿رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور ہدایت اور امتیاز حق و باطل کے کھلے دلائل کے ساتھ۔﴾

یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی "ھدی" کا ذکر قرآن مجید کے وصف کے طور پر کیا ہے ہر جگہ یہی کہا ہے کہ وہ ھدی ہے، یہ کہیں نہیں کہا کہ اس میں ھدی ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں باتوں میں کھلا ہوا فرق ہے۔ اس فرق کی رعایت آپ کو وہاں پر صاف دکھائی دے گی جہاں اللہ تعالیٰ نے تورات اور انجیل کا وصف دونوں طرح سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰی نُوْرًا وَّ هُدًی لِّلنَّاسِ ۔ (انعام:۹۱)

﴿ان سے پوچھو وہ کتاب کس نے اتاری جس کو موسیٰ روشنی اور لوگوں کے لیے ہدایت کی حیثیت سے لے کر آئے۔﴾

اور اس طرح بھی فرمایا ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰةَ فِیْهَا هُدًی وَّ نُوْرٌ ۔ (مائدہ:۴۴)

﴿بے شک ہم ہی نے تورات اتاری جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔﴾

نیز فرمایا ہے:

وَ اٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ فِیْهِ هُدًی وَّ نُوْرٌ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ التَّوْرٰةِ وَ هُدًی وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ ۔ (مائدہ:۴۶)

﴿اور ہم نے اس کو (یعنی عیسیٰ کو) عطا کی انجیل جس میں ہدایت اور روشنی ہے اور

تصدیق کرنے والی بنا کر اپنے سے پیشتر موجود تورات کی اور ہدایت و نصیحت بنا کر متقین کے لیے۔﴾

جہاں مطلق رکھا وہاں "فیہ ھدی" کہا اور جہاں زمانہ نزول یا متقین کے لیے خاص ہونے کی قید لگا دی وہاں "ھدی" کہا۔ اس فرق کو ملحوظ خاطر رکھیے۔

اس سے یہ بات صاف ہو گئی کہ جس نے اس کو "لا ریب ، فیہ ھدی للمتقین" پڑھا (یعنی "ریب" پر وقف کیا اور "فیہ" کو "ھدی" سے متعلق کر دیا) وہ اسے معنی کے اعتبار سے بھی اصل سے دور لے گیا کیوں کہ اس نے اس مفہوم کو اختیار کیا جو تعریف کے اعتبار سے کم تر درجہ کا تھا۔ دوسرے نظائر بھی اس کے خلاف تھے جیسا کہ پہلے گزرا، تیسری بات یہ کہ اس معنی کے لیے اس کے پاس کوئی نظیر بھی نہیں تھی۔

الذین یومنون بالغیب: 'الذین' حالت جر میں ہے اس وجہ سے کہ وہ لفظ "متقین" کی صفت کاشفہ ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ. وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ. (مومنون: ۱-۳)

﴿فائز المرام ہوئے وہ اہل ایمان جو اپنی نمازوں میں فروتنی اختیار کرنے والے ہیں اور جو لغویات سے احتراز کرنے والے ہیں۔﴾

اس طرح کی جگہوں پر کبھی تو الذین کو خبریت کی وجہ سے مرفوع مانتے ہیں جس کے مبتدا کی ضمیر محذوف ہوتی ہے اور کبھی اس کو منصوب قرار دیتے ہیں اور وہاں "اعنی" محذوف ہوتا ہے۔ دونوں ہی صورتیں معنی کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے کہ اس کو مبتدا مان کر حالت رفع میں سمجھا جائے اور "اولئک علی ھدی من ربھم" کو اس کی خبر قرار دیا جائے۔ اس کی درج ذیل وجہیں ہیں:

۱۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہاں پر متقین کی وضاحت کی گئی ہے اس لیے بعد والے جملہ کو اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ دوسری یہ کہ "اولئک علی ھدی من ربھم" جس طرح "الذین یومنون بالغیب" کی طرف لوٹ رہا ہے اسی طرح متقین کی طرف بھی لوٹ رہا ہے تو اس کو اس سے غیر متعلق کیسے رکھا جا سکتا ہے۔

۳۔ تیسری وجہ یہ کہ "اولئک علی ھدی من ربھم" کو اسی طرح لوٹنا چاہیے جس سے ابتداء کلام میں "ھدی" کا تعلق ہے۔ کیونکہ "ھدی للمتقین" کہنے کے بعد متقین کے اوصاف بیان کیے گئے

ہیں اور جب اوصاف بیان ہو چکے تو اس کو از سر نو لا کر کہا کہ یہ متقین ہی ہیں جو اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور ان ہی کے لیے کامرانی ہے۔ اس طرح ماسبق کی تاکید اور اس سے پوری مطابقت پیدا ہو گئی۔ پھر پہلے والے "ھدی" کو "متقین" کے ساتھ اور دوسرے کو مومنین بالغیب کے لیے خاص کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ یہاں ایک ہی گروہ کا تذکرہ ہے۔

۴۔ چوتھی یہ کہ ان لوگوں کے خیال کے مطابق اگر سلسلہ کلام کو منقطع کرنے اور اسے دوبارہ شروع کرنے کی بات مان لی جائے تو اس کی طرف رہنمائی اس وقت کہیں جا کر ہو گی جب آپ آیت "اولئک علی ھدی من ربھم" پر پہنچیں گے۔ اس وقت پہلے جملہ کی طرف آپ کو لوٹنا پڑے گا اور جو اس کے بالکل قریب ہے اسے چھوڑ دینا ہو گا۔ جس سے تالیف کلام میں خلل پڑے گا اور حسن ترتیب و ترکیب کی خلاف ورزی ہو گی۔

۵۔ پانچویں یہ کہ اس طرح کے سلسلہ کلام میں "اولئک" سے استیناف اوصاف گنانے کے بعد کیا جاتا ہے، جیسا کہ عنقریب آپ دیکھیں گے۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ نظائر کے درمیان فرق کیا جائے۔ اور جہاں تک الذین کو حالت رفع میں رکھنے کی بات ہے اس بنیاد پر کہ اس سے پہلے جمع کی ضمیر مقدر ہے جس کی وہ خبر ہے تو ایسا ماننے کی نہ تو کوئی ضرورت ہے اور نہ کوئی چیز اس کی داعی ہے۔ اور یہ بھی مناسب نہیں کہ اعنی کو محذوف مان کر اسے منصوب علی المدح قرار دیا جائے کیوں کہ اس کی مثالیں کلام میں زیادہ نہیں ہیں۔ نیز یہ ترکیب اس موقع پر موزوں ہوتی ہے جب ایسی بات کا ذکر کرنا ہو جو ماسبق میں نہ شامل ہو۔ جب کہ یہاں پر متقین اپنے مابعد پر مشتمل ہے اور اجمال کے بعد تفصیل تو قرآن مجید کا معروف طریقہ ہے۔

۱۳۔ اس مجموعہ آیات میں طرز بیان کی بلاغت:

اس مجموعہ آیات کے اندر بلاغت کے بہت سے ابواب جمع ہو گئے ہیں۔ مثلاً براعت استہلال، جواہر حکمت، انتہائی ایجاز، لطیف تعریضیں، صحت تقسیم، حسن نظام، لطف اشارہ، فصل خطاب، رعایت تاکید اور لفظوں کا انتخاب ان تمام محاسن کو اس نے سمیٹ لیا ہے۔ آئندہ فصلوں میں یہ باتیں کھل کر سامنے آ جائیں گی یہاں صرف اشارات پر ہم اکتفا کریں گے۔

ان آیتوں میں یہود پر کئی تعریضات ہیں جن کا ذکر اگلی فصل میں آئے گا۔ یہاں پر عام خطاب کے پہلو سے ہم ان پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

الٓمّٓ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کلام نہایت عمیق ہے جس کی گہرائی کی کوئی تھاہ نہیں۔ یہ اس کتاب کے فہم کی راہ میں اس کے قاری کے لیے پہلی تنبیہ ہے۔

ذلک الکتاب میں اس بات کو پہلے ہی لادیا گیا جو سورہ کے عمود یا مرکزی مضمون کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی آپ ؐ کی نبوت کا اثبات۔ اور اس بات کو دوٹوک الفاظ میں غایت درجہ ایجاز کے ساتھ کہا گیا اور خود کتاب کو اس امر پر دلیل ٹھہرایا کہ وہ من جانب اللہ ہے پھر "لا ریب فیہ" سے اس کو موکد کر دیا۔

اس کے بعد "ھدی للمتقین" کہہ کر اس کتاب اس کتاب کا علم حاصل کرنے کی راہ بتائی اور اس کے موانع سے خبردار کیا۔ اس طرح واضح کر دیا کہ ظاہر و بین علم کی بنیاد قلب کی صحت اور صلاحیت پر رکھی ہوئی ہے اور جس کا قلب بگڑ گیا ہو وہ حق کی معرفت سے دور ہو جاتا ہے۔ نیز یہ بھی بتا دیا کہ قلب کی صحت کا تمام دارومدار خشیت الٰہی پر ہے جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی کتاب حکمت کے شروع میں آیا ہے:

"خداوند کا خوف علم کا شروع ہے"۔ (امثال ۱:۷)

یہاں خشیت کے بجائے تقویٰ کا لفظ استعمال کیا گیا جو زیادہ جامع ہے، کیوں کہ تقویٰ علم و آ گہی اور نفس کے ان چیزوں سے بچنے کی طرف راغب ہونے سے پیدا ہوتا ہے جو اس کو آلودہ کرنے اور نقصان پہنچانے والی ہیں۔ چنانچہ یہ لفظ علم و عمل دونوں ابواب کا جامع ہے۔

نیز اس کو بر و احسان کے لفظ پر بھی ترجیح دی کیوں کہ نفع سے زیادہ نقصان سے انسان کو تحریک اور تنبیہ ہوتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ لالچ کے مقابلہ میں خوف زیادہ موثر اور کارگر ہوتا ہے۔ عقل کو عقل اور "حجر" (سوجھ بوجھ) اسی لیے کہا گیا ہے کہ اس کا ظہور نقصان کے احساس اور نفس کو برائیوں سے روکنے کے ساتھ ہی فوراً ہوتا ہے۔

اس کے بعد علم و عمل دونوں ابواب کی طرف رہنمائی کی گئی جو تقویٰ کے ساتھ وابستہ ہیں۔ علم کے باب کو مقدم رکھا اور فرمایا "الذین یومنون بالغیب" اور اس سے عقل کی حد اور انسانیت کے امتیازی وصف کو بتا دیا۔ کیوں کہ عقل مند انسان اس چیز کو جو اس کے پردہ عقل پر روشن ہوتی ہے اس طرح مان لیتا ہے گویا وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ اور کانوں سے سن رہا ہے۔ بلکہ ان چیزوں پر بھی ایمان لے آتا ہے جو اس کی بصارت اور سماعت کی حدوں سے پرے ہوتی ہیں۔

پھر "یقیمون الصلوٰۃ و مما رزقناھم ینفقون" کہہ کر اس حالت و کیفیت اور ان اعمال کو بتایا جو صحیح ایمان کے نتیجہ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ایمان محض تصور کا نام نہیں ہے بلکہ اس تصدیق کو کہتے ہیں جو دل میں پوری طرح جاگزیں ہو کر اس کے ارادہ کی سطح تک پہنچ جاتی ہے اور اس کے اندر غور و فکر اور رغبت و شوق کے جذبہ کو ابھار دیتی ہے۔ تمام اعمال صالحہ میں سے صرف نماز اور انفاق کا ذکر کر کے اس امر کی طرف اشارہ کر دیا کہ تقویٰ اور ایمان بالغیب کے اثر سے صحت مند دل کے اندر جو نیکیاں پنپتی

ہیں یہ ان سب کی جامع ہیں۔ سولہویں فصل میں ہم اس حقیقت پر روشنی ڈالیں گے۔ چوں کہ نماز اور انفاق ایمان بالغیب کا لازمی تقاضا ہیں اس لیے موصول یعنی "الذین" کو دوبارہ نہیں لایا گیا تا کہ معلوم ہو سکے کہ بعد کا جملہ اپنے ماسبق سے جڑا ہوا ہے۔

"مما رزقناھم" کے الفاظ سے درج ذیل باتوں کی طرف اشارہ ہو رہا ہے:

۱۔ ایک انفاق مال کے سلسلہ میں اس امر کے اعتراف کی طرف کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا عطا کردہ مال ہے۔

۲۔ دوسرے انفاق کی دلیل کی طرف کہ اس کے بخشے ہوئے مال میں سے کچھ حصہ خرچ کرنے کو عقل اس لیے واجب قرار دیتی ہے کہ اس کی شکرگزاری کا حق ادا ہو اور اس کے احسان کا اعتراف ہو سکے۔

۳۔ نیز انفاق کو سہل بنانے کی طرف۔ کیوں کہ کل میں سے تھوڑا خرچ کر دینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

۴۔ چوتھے انفاق کو مطلق رکھ کر اسے صدقات و خیرات کی جملہ اقسام کا جامع بنا دیا ہے۔

یہاں ظرف کو جو مقدم کیا ہے تو محض فواصل کی رعایت میں نہیں کیا ہے بلکہ اس طرح دلیل کو مقدم کر دیا گیا ہے۔ نیز یہاں تخصیص کا کوئی پہلو نہیں ہے، کیوں کہ بندہ کے پاس جو کچھ ہے وہ خدا ہی کا عنایت کیا ہوا ہے اس لیے تخصیص کے کوئی معنی نہیں۔

بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ یہ حرام رزق اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا نہیں ہوتا صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا. وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ" فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا. كُلًّا نُمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا. (اسراء: ۱۸-۲۰)

﴿جو دنیا کا طالب ہوتا ہے ہم اس میں اپنی مرضی سے جس کو جس قدر دینا چاہتے ہیں اسے جلد دے دیتے ہیں پھر ہم نے اس کے لیے جہنم رکھ چھوڑی ہے جس میں وہ خوار راندہ ہو کر داخل ہوگا۔ اور جو آخرت کا طالب ہوتا ہے اور اس کے شایان شان کوشش کرتا ہے اور وہ مومن بھی ہے تو یہی وہ لوگ ہیں جن کی کوششیں مقبول ہوں گی۔ ہم تیرے رب کی بخشش میں سے ہر ایک کی مدد کرتے ہیں، ان کی بھی اور

اُن کی بھی اور تیرے رب کی بخشش کسی پر بند نہیں۔ ﴾

لوگ اس تاویل کی طرف اس لیے گئے کہ یہاں انفاق فی سبیل اللہ سے جو مال مراد ہے وہ لازماً حلال ہونا چاہیے لیکن آیت کا سیاق اس امر کے بیان میں نہیں ہے۔ نیز قرآن مجید کی صراحت اور عقل سلیم کی شہادت اس سلسلہ میں کافی ہے اس لیے اس بات کو اس آیت سے مستنبط کرنے کی ضرورت نہیں۔

آیت "والذین یومنون بما انزل ......" میں ایمان کو اللہ کی ایک منزل کتاب سے وابستہ کیا جس سے وہ اس نوع کی تمام کتب الٰہی کو محیط ہو گیا اور ان تمام باتوں سے الگ ہٹ گیا جو بدل دی گئی تھیں اور جن میں لوگوں نے تحریف کر دی تھی۔ اس طرح کا عطف جس میں موصول کو دوبارہ لایا گیا ہو اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ موصوف ایک سے زیادہ ہیں جیسا کہ اس آیت میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی الَّذِی خَلَقَ فَسَوّٰی وَالَّذِی قَدَّرَ فَهَدٰی وَالَّذِی اَخْرَجَ الْمَرْعٰی. (الاعلیٰ:۱-۴)

﴿ اپنے خدائے برتر کے نام کی بڑائی بیان کر جس نے خاکہ بنایا، پھر نوک پلک سنوارے، جس نے اندازہ کیا، پھر ہدایت بخشی، جس نے نباتات اگائیں ...... ﴾

اس کی مثالیں بہت ہیں۔ دراصل وہ یہ بتاتا ہے کہ معطوف سابق کلام کے ساتھ ہر معنی میں مربوط نہیں ہے بلکہ اس کی ایک علیحدہ حیثیت ہے کیوں کہ تمام کتب الٰہی پر ایمان لانا ایمان کا ایک مستقل رکن ہے۔ بہت سے گمراہ فرقے کے لوگ ایمان بالغیب رکھتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور انفاق کرتے ہیں لیکن نبوت پر ایمان نہیں رکھتے۔ چنانچہ اس اصل کی یاددہانی کے لیے موصول کو مکرر لایا گیا۔ اگرچہ معاد بھی ایمان کا ایک مستقل رکن ہے۔ لیکن چوں کہ ایمان بالکتاب میں داخل ہے اس لیے موصول کا اعادہ نہیں کیا گیا۔ البتہ ایک مستقل فعل سے اس کو بیان کیا گیا، اور یہاں ظرف کو جو مقدم کیا ہے تو اس سے آخرت کی اہمیت کو جتانا مقصود ہے۔ محض فواصل کی رعایت میں ایسا نہیں کیا گیا ہے اور نہ ہی اس کا مقصد حصر ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔

اور "یومنون" کے بجائے "یوقنون" کا لفظ جو لایا گیا ہے تو اس میں ایک طرح کی تنبیہ ہے اس بات پر کہ لوگ آخرت کے متعلق بالعموم شک میں مبتلا رہتے ہیں اور اس سے غافل ہو جاتے ہیں جیسا کہ فرمایا ہے:

بَلِ ادّٰرَکَ عِلْمُهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ بَلْ هُمْ فِی شَکٍّ مِّنْهَا بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ. (نمل:۶۶)

﴿ بلکہ آخرت کے باب میں ان کا علم الجھا ہوا ہے، بلکہ اس کے آنے سے متعلق وہ شک میں مبتلا ہیں، بلکہ یہ لوگ اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں۔ ﴾

نیز خبر کے لیے ایقان کا لفظ زیادہ موزوں ہے۔ اس لیے بھی اسے اختیار کیا ہے۔

آیت "اولٓئک علی هدی من ربهم و اولٓئک هم المفلحون" میں جو استیناف ہے وہ ماسبق کی تاکید کے لیے ہے اور اولٓئک کو مکرر لا کر اسے مزید موکد اور مستحکم کر دیا ہے۔

"هم" بیان تخصیص کے لیے ہے یعنی وہ یہ بتا رہا ہے کہ فلاح و کامرانی صرف متقین کے لیے مخصوص ہے۔ یہ استیناف اور تکرار ان متقین کی رفعت شان کو ظاہر کرتا ہے اور "من ربهم" کا اضافہ بھی یہی فائدہ دے رہا ہے۔ پھر "من ربهم" کے اندر اور باتیں بھی پوشیدہ ہیں۔ ایک تو اس میں اس بات کا ذکر ہے کہ ہدایت رب کی بہت بڑی نعمت ہے دوسرے یہ کہ ہدایت اسی کی طرف سے آتی ہے، تیسرے یہ کہ ہدایت اس کی ربوبیت کا مظہر ہے۔ هدی کے بعد فلاح و کامرانی کا ذکر یہاں نتیجہ کے طور پر آیا ہے اس لیے اس کو اس کے بعد لایا گیا اور "هدی" کو نکرہ لانا نوع کا فائدہ دے رہا ہے۔ اس طرح هدی کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں وہ ان سب کا جامع بن گیا ہے۔

یہ آیت آغاز سورہ کی طرف لوٹ گئی ہے اور پورے سلسلہ کلام نے ایک مکمل حلقہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ گویا پوری بات یوں کہی گئی ہے کہ یہ کتاب الٰہی متقین کے لیے ہدایت ہے اور متقین وہ لوگ ہیں جن کے اوصاف ایسے ایسے ہیں اور یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں کیوں کہ دوسری ہدایت سے ان کا بہرہ ور ہونا ان کے اولٰی ہدایت پر ہونے کی دلیل ہے۔ یہ تاویل کا ایک پہلو ہے تفصیل آگے آتی ہے۔

اس مجموعۂ آیات میں جو جوامع الکلم آئے ہیں اور اس میں حکمت کے جو خزانے پوشیدہ ہیں ان کی کچھ جھلکیاں آپ عنقریب دیکھیں گے۔ یہاں ہم نے توجہ اس لیے دلائی کہ آپ وہ تاویل اختیار کریں جو زیادہ جامع، زیادہ وسیع، زیادہ خوبصورت اور زیادہ واضح ہو۔ آئندہ فصلوں پر جب آپ نظر ڈالیں گے تو بلاغت کے بہت سے گوشے سامنے آئیں گے۔ اس فصل میں ہم نے صرف چند اشارات پر اکتفا کیا ہے۔

۱۴۔ یادداشت:

اس سورہ میں یہود پر جو تعریضات ہیں ان کے لیے ہم علیحدہ سے ایک فصل قائم کریں گے۔ جہاں تک آیت "ذلک الکتاب لا ریب فیه" کا تعلق ہے تو اس ضمن میں یہ بات جاننے کی ہے کہ تحریف کی وجہ سے سابقہ کتابوں کی صحت مشکوک ہو گئی تھی۔ چنانچہ یہود سے ایک طرح سے تعریض کے طور

پر یہ بات کہی جا رہی ہے کہ اس وقت جو کتاب تمہارے ہاتھوں میں ہے اس کے متعلق تم شک میں مبتلا ہو اور اسی وجہ سے اس سے ہدایت حاصل نہیں کر پا رہے ہو اور حیرانی و سرگردانی کی حالت میں پڑے ہوئے ہو، جیسا کہ تمہارے پیغمبر یرمیاہ نے کہا:

﴿تم یہ کیوں کہتے ہو کہ ہم تو دانش مند ہیں اور خداوند کی شریعت ہمارے پاس ہے لیکن دیکھ لکھنے والوں کے قلم نے بطالت پیدا کی ہے۔ (یرمیاہ ۸:۸)﴾

اور جیسا کہ قرآن میں بھی آیا ہے:

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتُلِفَ فِيهِ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مُرِيبٍ". (ھود:۱۱۰)

﴿اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تو اس میں اختلاف کیا گیا، اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی نہ طے ہو چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور بے شک یہ لوگ اس کی طرف سے ایک الجھا دینے والے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔﴾

اس لیے تمہارے لیے ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ اس کتاب پر ایمان لاؤ جو تازہ بتازہ تمہارے رب کی طرف سے اس وعدہ کو پورا کرنے کی غرض سے آئی ہے جو تم سے کیا گیا تھا اور جس پر تمہیں ایمان لانے کا حکم ہوا تھا۔

نیز اس بات کو بھی پیش نظر رکھیے کہ شریعت یہود کی بنیاد خشیت الٰہی پر تھی اور تقویٰ کی شرط پر ان کو دوبارہ رحمت سے نوازنے کا وعدہ کیا گیا تھا، جیسا کہ فرمایا ہے:

فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ. (اعراف:۱۵۶)

"اَلَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ" میں تعریض کا پہلو یہ ہے کہ جب جب ان کے پیغمبران کی نظروں سے اوجھل ہوئے وہ الٹے پاؤں اپنی پرانی ڈگر پر لوٹ گئے، جیسا کہ تورات اور قرآن سے پتہ چلتا ہے۔ اور "یقیمون الصلوٰۃ و مما رزقنا ھم ینفقون" میں بھی ان پر تعریض ہے کیونکہ نماز انہوں نے ترک کر دی تھی اور دنیا کا لالچ اور بخل ان پر غالب آ گیا تھا۔ یہاں تک کہ ان کو یہ کہنے میں بھی باک نہیں ہوا کہ "ان اللہ فقیر و نحن اغنیاء" (آل عمران:۱۸۱) (اللہ تو فقیر ہے اور ہم صاحب مال ہیں) اور آیت "والذین یومنون بما انزل الیک" میں تو یہود پر بالکل کھلی ہوئی تعریض ہے۔

(جاری ہے)

مولانا امین احسن اصلاحی

درس صحیح بخاری

(کتاب المساقات کی روایات)

باب: فی الشرب و قولہ تعالیٰ و جعلنا من الماء کل شیء حی افلا یومنون و قولہ جل ذکرہ افرئیتم الماء الذی تشربون ء انتم انزلتموہ من المزن ام نحن المنزلون. لو نشاء جعلنہ اجاجا فلو لا تشکرون. الاجاج المر، المزن السحاب.

باب: پینے پلانے کے بارے میں، نیز اللہ تعالیٰ کے اس قول کہ "اور ہم نے ہر چیز کو پانی سے زندہ کیا تو کیا وہ اس کے بعد بھی ایمان لانے والے نہیں بنیں گے" اور اس قول کے بارے میں کہ "ذرا دیکھو تو پانی جس کو تم پیتے ہو، تم اس کو ابر میں سے اتارتے ہو یا ہم اتارتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو اس کو کھاری کر دیں پھر تم شکر کیوں نہیں کرتے"۔ اجاج کہتے ہیں کھاری کو اور مزن ابر کو۔

وضاحت:۔ یہ باب الشرب یعنی پینے پلانے کے بارے میں ہے لیکن اس کے تحت کوئی روایت نہیں ہے اور جو دو آیتیں تعلیق کے طور پر دی ہیں وہ بارش کے پانی کے رحمت اور مبارک ہونے کے بارے میں ہیں۔ ان میں پانی کے اللہ ہی کے اتارے ہوئے ہونے کا ذکر ہے۔ بعض نسخوں میں مساقات کا لفظ ہے۔ مساقات کہتے ہیں ایک خاص ٹھیکرے کے اوپر بند باندھ کر پانی سے فصلوں کو سیراب کرنا۔ شرب کا لفظ نہایت محدود ہے اور اس کا تعلق بہر حال زراعت سے نہیں ہے۔

باب: فی الشرب و من رای صدقۃ الماء و ھبتہ و وصیتہ جائزۃ مقسوم کان او غیر مقسوم و قال عثمان قال النبی ﷺ من یشتری بئر رومۃ فیکون دلوہ فیھا کدلاء المسلمین فشراھا عثمان رضی اللہ عنہ.

باب: پینے پلانے کے بارے میں اور اس شخص کے بارے میں جو کہتا ہے کہ پانی کا حصہ خیرات کرنا اور ھبہ کرنا اور اس کی وصیت کرنا جائز ہے، خواہ وہ بٹا ہوا ہو یا بن بٹا (مشترک) اور حضرت عثمانؓ نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کون ایسا ہے جو رومہ کا کنواں خریدے اور پھر اپنا ڈول اس میں

اس طرح ڈالے جیسے اور مسلمان ڈالیں تو حضرت عثمانؓ نے اس کو خریدا۔

وضاحت:۔ شرب کا تعلق پینے پلانے سے ہے لیکن پینے پلانے کا مسئلہ یہاں زیر بحث نہیں ہے۔ مسئلہ جو زیر بحث ہے وہ یہ ہے کہ پانی کا حکم کیا ہے۔ کیا وہ کسی کی ملکیت بھی ہو سکتا ہے، اس کو ہبہ بھی کیا جا سکتا اور اس میں وصیت بھی کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اگر ایک شخص کا کنواں ہے تو اس پر صرف اس کا حق ہے یا دوسروں کے بھی حقوق ہو سکتے ہیں۔ پانی کے جو مسائل ہیں وہ اس باب کی عبارت کے مطابق اس میں زیر بحث آنے چاہئیں، اور اس میں شک نہیں کہ یہ مسائل اہم ہیں۔

اس روایت میں انفاق فی سبیل اللہ کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ رومہ کا کنواں کسی یہودی کی ملکیت تھا اور وہ مسلمانوں کے لیے پانی حاصل کرنے میں مشکلات پیدا کرتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں سے اپیل فرمائی کہ وہ اس کو خرید کر تمام مسلمانوں کے لیے وقف کر دیں اور اس پر اپنی ملکیت کا دعویٰ بھی نہ کریں۔ یہ دریا دلی حضرت عثمان غنیؓ نے دکھائی۔ وہ اپنی دولت کو اس طرح کے مواقع پر خرچ کر کے اپنا اجر عنداللہ محفوظ کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے یہودی سے معاملہ کر لیا اور مسلمانوں کی ایک بڑی مشکل حل ہو گئی۔

۞ حدثنا سعید ابن ابی مریم حدثنا ابو غسان قال حدثنی ابو حازم عن سھل بن سعدؓ قال اتی النبی ﷺ بقدح فشرب منه و عن یمینه غلام اصغر القوم و الاشیاخ عن یسارہ فقال یا غلام اتاذن لی ان اعطیة الاشیاخ قال ما کنت لاوثر بفضلی منک احدا یا رسول اللہ فاعطاہ ایاہ.

ترجمہ:۔ ابن سعدؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک پیالہ پیش کیا گیا اور آپ نے اس میں سے پیا۔ آپ کی دائیں جانب ایک لڑکا تھا جو حاضرین میں سب سے چھوٹی عمر کا تھا اور بائیں جانب بزرگ لوگ بیٹھے تھے تو آپ نے فرمایا لڑکے! تم اجازت دیتے ہو کہ میں ان بزرگوں کو یہ پیالہ دے دوں؟ تو اس نے کہا یا رسول اللہ! یہ ممکن نہیں ہے کہ جو حصہ میرے لیے آپ کی طرف سے ہے میں ایثار کر کے دوسروں کو دے دوں۔ آخر آپ نے یہ پیالہ اسی کو دے دیا۔

وضاحت:۔ لڑکے نے بات تو لاجواب کی ہے۔ اس سے جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے کوئی بخشش کسی کو ملتی ہو اور اس معاملے میں وہ حریص ہو اور کسی کو نہ دینا چاہے تو اس پر بخالت کا الزام نہیں آئے گا۔ وہ حق دار ہے کہ اس کو خود برتے۔ ہاں اگر اس کا جی چاہے تو بطور تبرک اس میں سے کچھ کسی کو دے سکتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ہمیں آداب سکھائے ہیں کہ کوئی چیز دینی ہو تو پہلے داہنی طرف کے لوگوں کی طرف سے شروع کرنا چاہیے۔ اس کا تعلق آداب سے ہے۔ اس پر فقہی احکام لاگو کرنا زیادتی ہوگی۔ آداب کو آداب ہی کی حد تک رکھیے، واجبات نہ بنایئے ورنہ بڑی زحمت ہوگی۔ بہت ساری چیزیں مثلاً داہنے ہاتھ سے پانی پینا، بیٹھ کر پینا وغیرہ آداب میں سے ہے۔ ان پر عمل کرنا اور معاشرہ میں رواج دینا ضروری ہے۔ لیکن بعض دفعہ حالات کے لحاظ سے ان کو بدلنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ آداب میں تبدیلی کی کئی مثالیں خود نبی ﷺ کے عمل سے پیش کی جا سکتی ہیں۔ احکام کو اس طرح ٹالا نہیں جا سکتا۔

امام صاحب نے اس روایت کو ہبہ اور وصیت وغیرہ کے احکام کا ماخذ بنانا چاہا ہے تو یہ مضمون اس روایت سے نہیں نکلتا۔ ہبہ میں رجوع جائز ہے یا نہیں۔ اگر آنحضرت ﷺ واپس لینا چاہتے تو رجوع کر سکتے یا نہیں۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔

۞ حدثنا ابو الیمان اخبرنا شعیب عن الزھری قال حدثنی انس بن مالکؓ انھا حلبت لرسول اللہ ﷺ شاۃ داجن و ھی فی دار انسؓ و شیبه لبنھا بماء من الماء من البئر التی فی دار انس فاعطی رسول اللہ ﷺ القدح فشرب منه حتی اذا نزع القدح من فیه و علی یسارہ ابوبکرؓ و عن یمینه اعرابی فقال عمرؓ خاف ان یعطیه الاعرابی اعط ابابکر یا رسول اللہ (ﷺ) عندک فاعطاہ الاعرابی الذی علی یمینه ثم قال الایمن فالایمن.

ترجمہ:۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے لیے ایک پلی ہوئی بکری دوہی گئی جو انسؓ کے گھر میں تھی اور اس میں اس کنویں کا پانی ملایا گیا جو حضرت انسؓ کے گھر میں تھا۔ پیالہ آنحضرت ﷺ کو پیش کیا گیا۔ آپ نے اس میں سے پیا یہاں تک کہ پیالہ منہ سے ہٹا دیا۔ آپ کے پاس حضرت ابوبکرؓ تھے اور دائیں ایک دیہاتی بیٹھا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس اندیشہ سے کہ آنحضرت ﷺ کہیں دیہاتی کو پیالہ نہ پکڑا دیں، عرض کی کہ یا رسول اللہ، حضرت ابوبکرؓ کو دیجیے وہ آپ کے پاس ہیں۔ لیکن نبی ﷺ نے اعرابی کو دیا جو آپ کے دہنے تھا اور فرمایا پہلے دایاں پھر اس کا دایاں حق دار ہوتا ہے۔

وضاحت:۔ حضرت عمرؓ کے کہنے کی اس کے سوا کوئی علت نہیں تھی کہ دائیں طرف والا بدو تھا اور دوسری طرف جلیل القدر صحابی ابوبکرؓ تھے۔ ان کا خیال ہوا کہ اگر یہ موقع مشرف ہونے کا ہے تو ابوبکرؓ کا حق ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو حضرت ابوبکرؓ کے لیے مشرف ہونے کے کیا کم مواقع تھے۔ آنحضرت ﷺ نے اس موقع پر بدو کے حق کو مقدم رکھا اور یہی ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ اسلام میں غریبوں کی بڑی وقعت اور عزت ہے۔ اس معاملہ میں آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کی بات بھی نہیں سنی اور یہ تنبیہ کر دی کہ

الايمن فالايمن ۔ آنحضرت ﷺ نے جو کیا وہی ٹھیک تھا اس لیے کہ بڑے آدمیوں کا معاملہ تھا۔ اگر آپ حضرت عمرؓ کا مشورہ قبول فرما لیتے تو اس سے یہ اصول پیدا ہو جاتا کہ بڑوں کے ہوتے ہوئے چھوٹوں کا حق نہیں رہتا۔ آنحضرت ﷺ نے جو طریقہ اختیار فرمایا یہی صحیح تربیت ہے۔

باب: من قال ان صاحب الماء احق بالماء حتی یروی لقول النبی ﷺ لا یمنع فضل الماء.

باب: جس کا کہنا نبی ﷺ کے اس ارشاد کے باعث کہ فاضل پانی روکا نہیں جاسکتا، یہ ہو کہ پانی کا مالک جب تک کھیتی کو سیراب نہ کر لے، پانی کا زیادہ حقدار ہے۔

وضاحت: مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے اصل حق صاحب الماء کا تسلیم کر لیا کہ پانی کا حق دار وہی ہے۔ تو مسئلہ کی نوعیت کیا ہوگی۔ صاحب الماء سے یہ بات نکلتی ہے کہ پانی مملوک بھی ہو سکتا ہے۔

۞ حدثنا عبداللہ بن یوسف اخبرنا مالک عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی ہریرۃؓ ان رسول اللہ ﷺ قال لا یمنع فضل الماء یمنع بہ الکلاء.

ترجمہ:۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ فالتو پانی کو اس بہانے سے نہ روکا جائے کہ گھاس کو محفوظ کرنا ہے۔

وضاحت:۔ ایک شخص جب کنواں بناتا ہے تو اس کے اطراف میں ایک خاص رقبہ مخصوص ہو جاتا ہے جہاں جانور آتے اور پانی پیتے ہیں۔ کنویں کے پانی سے سیراب ہو کر آس پاس کی زمین میں گھاس بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص لوگوں کے مال مویشی آنے نہ دے کہ یہ ہماری گھاس چر جاتے ہیں اور گھاس کی حفاظت کا بہانہ بنا کر فالتو پانی روک لے تو اس سے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ کسی کو اپنے فالتو پانی کے استعمال سے کسی کو روکنے کا حق نہیں ہے۔

۞ حدثنا یحیی بن بکیر حدثنا اللیث عن عقیل عن ابن شہاب عن ابن المسیب و ابی سلمۃ عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ ﷺ قال لا تمنعوا فضل الماء لتمنعوا بہ فضل الکلاء.

ترجمہ:۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اپنا فالتو پانی مت روکو اس مقصد کے لیے کہ اپنی فالتو گھاس کو بچاؤ۔

وضاحت:۔ یہاں الفاظ ذرا بدل گئے ہیں لیکن مطلب اور واضح ہو گیا کہ گھاس کو بچانے کا بہانہ بنا کر لوگوں کو فالتو پانی سے محروم نہ کیا جائے۔

باب: من حفر بئراً فی ملکہ لم یضمن.

باب: جس نے اپنی زمین میں کنواں کھودا تو وہ اس کی وجہ سے ہونے والے کسی نقصان کا ضامن نہیں ٹھہرے گا۔

وضاحت:۔ کنواں تو اس شخص نے اپنی زمین میں کھودا۔ اگر کسی کی بکری اس میں گر جاتی ہے تو کنویں کے مالک کو ضامن نہیں ٹھہرائیں گے، اس لیے کہ کنواں کھودنا ایک ضروری اور مفید کام ہے جس کا فائدہ دوسرے لوگوں کو بھی پہنچتا ہے۔ البتہ ایک بات قابل غور ہے۔ اگر کنویں والے کی کسی سازش کو اس میں دخل ہو اور ثابت ہو جائے کہ کوئی کوتاہی قصداً کی گئی ہے تب اس کے خلاف کارروائی ہوگی لیکن اگر کوئی کوتاہی اس نے نہیں کی تو کسی کے نقصان کا وہ ضامن نہیں ہوگا۔ یہ استثنا باب کی عبارت میں ملحوظ نہیں رکھا گیا۔

۞ حدثنا محمود اخبرنا عبیداللہ عن اسرائیل عن ابی حصین عن ابی ہریرۃؓ قال قال رسول اللہ ﷺ المعدن جبار والبئر جبار والعجماء جبار و فی الرکاز الخمس.

ترجمہ:۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ معادن میں حادثہ ہو جائے تو کوئی معاوضہ نہیں ہوگا، کنویں میں پہنچنے والے نقصان پر اور جانور سے پہنچنے والی تکلیف پر بھی کوئی معاوضہ نہیں ہوگا۔ اور زمین کے دفینہ میں سے خمس دینا ہوگا۔

وضاحت:۔ معدن سے مراد کان ہے جس میں کھدائی کرتے ہوئے طرح طرح کے حادثات پیش آ سکتے ہیں۔ کانوں میں انسان اور مویشی گر بھی سکتے ہیں۔ عجماء چوپائے کے لیے مستعمل ہے۔ جبار کے معنی ھدر کے ہیں یعنی جس کا انتقام نہ لیا جائے اور خون رائیگاں جائے۔ اگر کنویں میں کوئی گر کر مر جاتا ہے یا جانور کسی کو سینگ مار دیتا ہے تو جو نقصان ہوگا اس کا کوئی معاوضہ نہیں ملے گا۔ ان چیزوں میں کسی کو ضامن نہیں ٹھہرایا ہے۔ زمین کے دفینہ میں پانچواں حصہ ہے یعنی جو حصہ مال غنیمت کے لیے مقرر ہے وہی حصہ

دفینہ میں سے حکومت کو جائے گا۔

روایت اپنے محل میں ٹھیک ہے لیکن اس کا تعلق کتاب الشرب سے بس اتنا ہی ہے کہ اس میں کنویں کا ذکر ہے۔

باب: الخصومة فی البئر والقضاء فیها.

باب: کنویں کے بارے میں جھگڑا اور اس کا فیصلہ

❁ حدثنا عبدان عن ابی حمزة عن الاعمش عن شقیق عن عبدالله عن النبی ﷺ قال من حلف علی یمین یقتطع بها مال امریءٍ هو علیها فاجر" لقی الله وهو علیه غضبانُ فانزل الله تعالیٰ اِنَّ الذین یَشْتَرُون بعهدِ اللّٰهِ وَ ایمانِهِم ثمنًا قلیلًا الایة فجاءَ الاشعث فقالَ ما حدّثکم اَبُو عبدالرحمن فی انزلت هذهِ الایة کانَتْ لِی بئر" فی ارضِ ابنِ عمٍ لِی فَقَالَ لِی شُهودُکَ قلتُ مالِی شُهُود" قالَ فَیَمِینُه' قلتُ یا رسولَ الله اذًا یحلِفُ فذکر النبی ﷺ هذا الحدیث فانزل الله ذالک تصدیقا له.

ترجمہ:۔ عبداللہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کوئی قسم کھائی اس مقصد سے کہ کسی کا مال ہڑپ کرے اور وہ اس میں جھوٹا ہو تو اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری "بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی جھوٹی قسموں کے عوض دنیا کا تھوڑا مال حاصل کر لیتے ہیں" ...... آخر آیت تک۔ اس کے بعد اشعث آئے تو انہوں نے کہا عبداللہؓ کیا بیان کر رہے تھے، یہ آیت تو میرے بارے میں اتری ہے۔ ہوا یہ تھا کہ میرے چچازاد بھائی کی زمین میں میرا ایک کنواں تھا۔ آنحضرت ﷺ نے مجھ سے پوچھا تیرے پاس گواہ ہیں، میں نے کہا گواہ تو نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا تو پھر دوسرے فریق سے قسم لی جائے گی۔ میں نے کہا یا رسول اللہ وہ تو قسم کھا لے گا۔ اس وقت آپ نے یہ حدیث فرمائی، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں یہ آیت اتاری۔

وضاحت:۔ حضرت اشعثؓ کا ایک کنواں ان کے چچازاد بھائی کی زمین میں تھا۔ جس کا کچھ جھگڑا تھا۔ چچازاد بھائی اس پر اپنی ملکیت جتاتا ہوگا۔ اشعث آنحضرت ﷺ کے پاس مقدمہ لے گئے۔ آپ نے حکم دیا کہ اپنے گواہ پیش کرو۔ انہوں نے کہا گواہ تو کوئی نہیں ہے۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا پھر تو دوسرے فریق سے قسم لینی پڑے گی۔ اس لیے کہ البینة علی المدعی والیمین علی من انکره اسلام میں مسلم اصول ہے۔ مدعی اپنے دعویٰ کے حق میں عدالت میں ثبوت پیش کرنے کا ذمہ دار ہوگا جبکہ

قسم مدعی علیہ کا حق ہے۔ اس پر اشعث نے کہا کہ وہ تو قسم کھا لے گا۔ اس پر حضور ﷺ نے وہ بات فرمائی جو اوپر نقل ہوئی ہے کہ جس نے جھوٹی قسم کھائی اس مقصد سے کہ کسی کا مال ہڑپ کرے تو قیامت کے دن اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہوگا۔

یہ امت حق کی شہادت کے لیے مبعوث کی گئی ہے۔ اس لیے جھوٹ بولنا، جھوٹی قسم کھانا، جھوٹی گواہی دینا وغیرہ اس کے لیے بہت بڑے گناہوں میں شمار کیا گیا ہے۔ حدیث میں بتائے گئے واقعہ میں دوہرا جرم بیان ہوا ہے۔ ایک، دوسرے کے مال کو ہتھیانے کی کوشش کرنا اور دوسرا اس کے لیے جھوٹی قسم کو ذریعہ بنانا۔ لہٰذا اس جرم پر اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکے گا۔

راوی آخر میں جو یہ کہتے ہیں کہ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تو اس آیت میں یہود کا جرم بتایا ہے کہ وہ اللہ کا عہد پورا نہیں کرتے اور جھوٹی قسمیں کھا کر دنیاوی مفاد حاصل کرتے ہیں۔ اس حدیث میں اس آیت کا شان نزول بیان نہیں ہوا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس آیت سے حدیث کا یہ مضمون بھی نکلتا ہے۔

باب: اثم من مَنَع ابنَ السَّبِیلِ مِنَ المَاءَ.

باب: اس شخص کا گناہ جو مسافر کو پانی نہ دے

❁ حدثنا موسیٰ بن اسماعیل حدثنا عبدالواحد بن زیاد عن الاعمش قال سمعت ابا صالح یقول سمعت اباهریرةؓ یقول قال رسول الله ﷺ ثلثة لا ینظر الله الیهم یوم القیمة ولا یزکّیهم ولهم عذاب" الیم" رجل کان له' فضل ماء بالطریق فمنعه' من ابن السبیل و رجل بایع اماما لا یبایعه الا لدنیا فان اعطاه منها رضی و ان لم یعطه منها سخط و رجل اقام سلعته بعد العصر فقال والله الذی لا اله غیره لقد اعطیت بها کذا و کذا فصدقه رجل ثم قرأ هذه الایة ان الذین یشترون بعهدالله و ایمانهم ثمنا قلیلاً.

ترجمہ:۔ ابوصالح کہتے ہیں کہ میں نے ابوہریرہؓ سے سنا، وہ فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تین شخص ہوں گے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کی طرف نظر اٹھائے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ وہ شخص کہ جس کے پاس فالتو پانی ہو اور وہ راستے میں ہو اور وہ اس کو مسافروں سے روکے۔ اور وہ شخص جو کسی امام کے ہاتھ پر بیعت کرے لیکن غرض اس کی دنیا ہو۔ اگر امام اس میں سے اسے کچھ دے دے تو اس سے راضی رہے اور اگر نہ دے تو اس سے ناراض ہو جائے۔ اور وہ

شخص جو اپنا سامان فروخت لے کر عصر کی نماز کے بعد بیٹھ جائے اور کہے کہ اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اس مال کی یہ قیمت ادا کی اور دوسرا شخص اس کی بات کو سچ مان کر مال خرید لے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی کہ ان الذین یشترون بعهدالله ثمنا قليلا۔

وضاحت:۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا کسی بندے کی طرف نظر نہ اٹھانا اور اس کو پاک نہ کرنا اس سے غایت درجہ نفرت کا اظہار ہے۔ قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ یہود سے اپنی غضبناکی کا اظہار اسی طرح کرے گا۔ اللہ تعالیٰ تین شخصوں کے معاملہ میں بھی اسی طرح کی نفرت کا اظہار فرمائے گا۔ ایک وہ شخص جس کے پاس فالتو پانی ہے لیکن وہ سفر کے دوران کسی دوسرے مسافر کو نہیں دیتا جبکہ متبادل طریقہ سے اس کو پانی ملنے کا امکان نہیں ہوتا۔ دوسرا وہ شخص جو کسی امام کے ہاتھ پر بیعت کرے اور مقصد اس کا حصول دنیا ہو، اگر کچھ ملتا رہے تو راضی رہے ورنہ ناراض ہو جائے۔ گویا اس کی بیعت اپنی غرض کے لیے ہوتی ہے۔ غرض پوری ہوتی ہے تب امام کا مطیع ہوتا ہے اور نہ پوری ہو تو اسے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اور تیسرا وہ شخص ہے جو عصر کے بعد بازار میں بیٹھ جاتا اور جھوٹی قسم کھا کر اپنا مال بیچتا ہے اور خریدنے والا اس کی قسم کا اعتبار کر کے لے لیتا ہے۔ عصر کے بعد قسم کھا کر مال بیچنے کا محرک یہ ہو سکتا ہے کہ دن بھر تو زیادہ کمائی ہوئی نہیں۔ اب دن بہت کم رہ گیا ہے۔ اس لیے قسم کھا کر کچھ مال بیچ لیا جائے۔ ان تینوں میں قدر مشترک اپنے مفادات کو پورا کرنا، مال سے محبت کرنا اور دوسروں کو نقصان پہنچانے میں سنگ دلی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ یہ کردار یہود کا ہے۔ اسی لیے حضورؐ نے ان کے لیے قیامت کی سزا بھی وہی بتائی جو قرآن میں یہود کے لیے بیان ہوئی ہے۔

امام کی بیعت کے بارے میں حضورؐ نے دوسرے شخص کا رویہ جو بتایا ہے یہی آج کل ہماری ملکی سیاست میں رائج ہے۔ دنیاوی مفادات پورے ہونے کی توقع پر لوگ سیاسی پارٹیوں میں شامل ہوتے ہیں اور جب توقع پوری نہیں ہوتی تو فلور کراسنگ کر لیتے ہیں۔

اس روایت میں الفاظ ہیں ثم قرء هذه الاية۔ یہ تعبیر صحیح ہے۔ نزل فيه سے تعبیر کرنے میں بات مختلف ہو جاتی ہے اور اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے۔

باب: سَكْرِ الأنْهارِ

باب: نہروں کی بندش کے بارے میں

❁ حدثنا عبدالله بن يوسف حدثنا الليث قال حدثني ابن شهاب عن عروة عن

عبدالله بن زبير انه حدثه أنّ رَجُلًا مِن الانصارِ خاصم الزبير عندالنبي ﷺ في شراج الحرة التي يسقون بها النخل فقال الانصاري سرح الماء يمر فابى عليه فاختصما عندالنبي ﷺ فقالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لِلزبير اَسقِ يا زُبير ثم ارسلِ المَاء الى جارِكَ فغضِبَ الانصارِيُّ فقالَ ان كان ابنَ عَمَّتِكَ فتلوَّن وَجهُ رسولِ الله ﷺ ثم قال اسق يا زبير ثم احبس الماء حتى يرجع الى الجدر فقال الزبير والله اني لا حسب هذه الاية نزلت في ذالك فلا و ربك لا يومنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم۔

ترجمہ:۔ عروہ کہتے ہیں کہ ان سے عبداللہ بن زبیرؓ نے بیان کیا کہ انصار میں سے ایک شخص نے زبیرؓ کے خلاف نبی ﷺ کی خدمت میں حرہ کی نہر کے بارے میں مقدمہ پیش کیا جس کے پانی سے وہ اپنے کھجور کے درختوں کو سیراب کیا کرتے تھے۔ انصاری کا مطالبہ یہ تھا کہ پانی چھوڑے رکھو کہ گزرتا رہے، زبیرؓ نے اس سے انکار کیا پھر دونوں آنحضرت ﷺ کے سامنے یہ مقدمہ لائے۔ آنحضرت ﷺ نے زبیر سے فرمایا کہ تم اپنا باغ سیراب کر لو تو اپنے ہمسایہ کی زمین پر پانی چھوڑ دیا کرو۔ یہ سن کر انصاری غصہ ہوا اور کہنے لگا کیوں نہیں! زبیرؓ آپ کی پھوپھی کے بیٹے ہیں نا۔ رسول اللہ ﷺ کا چہرہ متغیر ہو گیا اور آپ نے فرمایا اے زبیر! اپنے باغ کو سیراب کرو اور پھر پانی روکے رکھو یہاں تک کہ وہ جدر تک لوٹ جائے۔ زبیرؓ نے کہا اللہ کی قسم میں سمجھتا ہوں یہ آیت فلا و ربك لا يومنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم (پس نہیں، تیرے رب کی قسم یہ لوگ ایمان لانے والے اس وقت تک نہیں بن سکتے جب تک اپنے درمیان ہونے والے نزاعات میں تجھ کو حکم نہ مانیں) اسی بارے میں نازل ہوئی ہے۔

وضاحت:۔ الحرہ پتھریلی زمین کو کہتے ہیں۔ مدینہ کے پاس زمین کا ایک حصہ آتش فشانی لاوے پر مشتمل ہے۔ اس کو حرہ کا نام دیا گیا ہے۔ شراج سے مراد برساتی نالے ہیں۔ حرہ میں کوئی برساتی نالا تھا جس کے پانی سے زبیرؓ اپنی زمین سیراب کرتے تھے۔ اس دور میں اور اس علاقہ میں اس طرح کی کسی مصنوعی نہر کا گزر نہیں تھا جیسا کہ آج کل ہمارے علاقوں میں ہیں۔ حضرت زبیرؓ کا باغ اوپر تھا اور انصاری کا نیچے۔ زبیر پانی کو روک لیتے اور جب تک ان کا باغ سیراب نہیں ہوتا تھا اس وقت تک نہیں چھوڑتے تھے۔ اس صورت میں یہ مسئلہ پیدا ہوتا تھا کہ جب تک ان کی ضرورت پوری نہ ہوتی انصاری کو انتظار کرنا پڑتا۔ انصاری کا مطالبہ یہ تھا کہ پانی کو نہ روکیں بلکہ چلنے دیا کریں۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مقدمہ پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ زبیرؓ تم اپنا باغ سیراب کر لو تو پھر پانی اپنے ہمسایہ کی طرف چھوڑ دیا کرو۔ انصاری اس پر غصہ ہوا اور طعنہ دیا کہ آپ نے اپنے پھوپھی کے بیٹے کے حق میں فیصلہ دیا۔ آنحضرت

ﷺ کا چہرہ متغیر ہوگیا آپ نے فرمایا کہ زبیرؓ اپنے باغ کو سیراب کرو اور پانی کو روکو یہاں تک کہ وہ جدر تک لوٹ جائے۔

جدر کے معنی کیا ہیں اس میں بڑے جھگڑے ہیں۔ لوگوں نے اس لفظ کو منڈیر کے معنی میں لیا ہے جو پانی کو روکنے کے کام آتی ہے۔ لیکن امام بخاری نے آگے روایت میں شرح کر دی ہے کہ جدر سے مراد جڑ ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ پہلی مرتبہ میرے سامنے آیا ہے۔ کسان جانتا ہے کہ باغ کے لیے لازم ہے کہ اتنا پانی کھڑا کیا جائے کہ درخت کی جڑ تک پانی جذب ہو کر پہنچ جائے۔ آگے الی الکعبین کے الفاظ بھی آرہے ہیں۔ یعنی پانی کو روکو ٹخنوں تک، تو ظاہر ہے اتنا پانی کھڑا کرنے کے لیے کچھ دیر روکنا پڑے گا۔ اتنا پانی کھڑا ہوگا تو جذب ہو کر جڑ تک پہنچ جائے گا۔

میرے نزدیک لفظ جدر نہیں بلکہ جذر ہے، ایک نقطہ کا فرق ہے۔ جذر اور جذور کا لفظ پودے کی اس جڑ کے لیے آتا ہے جو زمین کے اندر ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ غلطی کہاں ہوئی۔ میرے نزدیک مناولہ کے طریقہ سے جو روایت ہوتی ہے، اس میں یہ ہوتا ہے کہ شیخ اجازت دے دیتا ہے کہ میری کتاب سے روایت کریں۔ اب اگر اس میں کوئی لفظ غلط لکھا ہوا ہے تو ظاہر ہے کہ وہی نقل ہوگا۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ آگے روایت میں الی الکعبین سے جو وضاحت کی گئی ہے اس سے بھی میری بات کو تقویت ملتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اوپر کی زمین والا اتنا پانی روک لے جو پودوں کی جڑوں تک پہنچ جائے۔ اس کا اندازہ ٹخنوں تک پانی روک کر لگایا جا سکتا ہے۔ پس ایسی نہروں کے لیے جو وادیوں سے نکلتی تھیں یا بارشوں سے چل پڑتی تھیں ضابطہ یہ ہوا کہ جس کی زمین اوپر ہوگی اس کا حق ہے کہ اتنا پانی روکے کہ وہ فصل کی جڑوں تک کے لیے کافی ہو اور پھر نیچے والے کے لیے چھوڑ دے۔ پانی اسی ترتیب سے آگے چلے گا یہاں تک کہ پانی ختم ہو جائے گا۔

انصاری کا یہ موقف کہ زبیر چونکہ آپ کی پھوپھی کے بیٹے ہیں اس لیے حضورؐ نے ان کے حق میں فیصلہ دے دیا نہایت بدتمیزی پر مبنی تھا اور آنحضرتؐ پر اس اعتماد کے منافی تھا جو ہر مسلمان کو آپ پر ہونا چاہیے۔ اسی لیے آپ نے دوسری مرتبہ اور زیادہ وضاحت کے ساتھ اپنا فیصلہ سنایا۔

حضرت زبیرؓ نے کہا اللہ کی قسم یہ آیت فلا و ربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم، اسی بارے میں نازل ہوئی ہے۔ میرے نزدیک آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس آیت سے اس طریقے کے جھگڑوں کا حکم بھی نکلتا ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ اسی بارے میں نازل ہوئی، یہ ٹھیک نہیں۔ سیاق و سباق کے مطابق آیت تو منافقین کے بارے میں ہے۔

باب: شرب الاعلیٰ قبل الاسفل

باب: اس بارے میں کہ جس کا کھیت بلندی پر ہو وہ نیچے والے سے پہلے سیراب کرے

۞ حدثنا عبدان اخبرنا عبداللہ اخبرنا معمر عن الزھری عن عروۃ قال خاصم الزبیرؓ رجل من الانصار فقال النبی ﷺ یا زبیر اسق ثم ارسل فقال الانصاری انہ ابن عمتک فقال علیہ السلام اسق یا زبیر ثم یبلغ الماء الجدر ثم امسک فقال الزبیرؓ فاحسب ھذہ الایۃ نزلت فی ذالک فلا و ربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم.

ترجمہ: حضرت زبیرؓ کی کسی انصاری سے نزاع تھی تو آنحضرت ﷺ نے حکم دیا زبیرؓ تم اپنا کھیت سیراب کرنے کے بعد پانی چھوڑ دیا کرو۔ اس پر انصاری نے کہا آپ کی پھوپھی کا بیٹا ہے نا اس لیے۔ تب آپ نے فرمایا زبیر تم اپنے کھیت کو پانی پلا لو اور پھر پانی جدر تک پہنچ جائے تو اسے روک لو۔ زبیر کہتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ آیت فلا و ربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم اسی بارے میں نازل ہوئی ہے۔

باب: شرب الاعلی الی الکعبین

باب: اس بارے میں کہ بلند کھیت والا پانی ٹخنوں تک بھر لے

۞ حدثنا محمد اخبرنا مخلد قال اخبرنی ابن جریج قال حدثنی ابن شھاب عن عروۃ بن الزبیرؓ انہ حدثہ ان رجلا من الانصار خاصم الزبیر فی شراج من الحرۃ یسقی بھا النخل فقال رسول اللہ ﷺ اسق یا زبیر فامرہ بالمعروف ثم ارسل الی جارک فقال الانصاری ان کان ابن عمتک فتلون وجہ رسول اللہ ﷺ ثم قال اسق ثم احبس حتی یرجع الماء الی الجدر واستوعی لہ حقہ فقال الزبیر و اللہ ان ھذہ الایۃ انزلت فی ذالک فلا و ربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم. قال ابن شھاب فقدر الانصار والناس قول النبی ﷺ اسق ثم احبس حتی یرجع الی الجدر و کان ذالک الی الکعبین.

ترجمہ:۔ عروۃ ابن زبیرؓ سے روایت ہے کہ ایک انصاری شخص نے حرہ کے برساتی نالے کے بارے میں جھگڑا کیا جس سے وہ کھجور کے درختوں کو پانی دیا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا زبیرؓ تم پانی پلالو، آپ نے یہ معروف کے مطابق حکم دیا۔ پھر پانی اپنے ہمسایہ کی طرف چھوڑ دینا۔ انصاری نے کہا کہ یہ اس وجہ سے کہ زبیرؓ آپ کے پھوپھی کے بیٹے ہیں۔ یہ سن کر آنحضرت ﷺ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، آپ نے فرمایا کہ زبیر اپنے درختوں کو پانی پلاؤ پھر پانی روک لو یہاں تک کہ وہ جدر تک آ جائے۔ زبیرؓ کا جو واجبی حق تھا وہ آپ نے دلا دیا۔ زبیر کہتے تھے کہ آیت فلا و ربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم اسی باب میں اتری ہے۔ ابن شہاب کہتے ہیں کہ انصار اور دوسرے لوگوں نے آنحضرت ﷺ کے اس فرمان کا کہ پانی کو روک لو یہاں تک کہ وہ جدر تک پہنچے، یہ اندازہ کیا کہ پانی ٹخنوں تک بھر جائے۔

وضاحت:۔ فامرہ بالمعروف یعنی یہ کہ اپنے کھیت کو پانی پلالو دستور کے مطابق، کمی بھی نہیں کرنی چاہیے لیکن حق سے زیادہ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن جب آپ نے دیکھا کہ یہ شخص اس طریقہ کی گستاخانہ باتیں کرتا ہے تو آپ نے پوری وضاحت کردی کہ پانی پلاؤ یہاں تک کہ پانی جڑ تک پہنچے۔ اس ہدایت سے آپ نے زبیرؓ کا حق محفوظ کر دیا۔

قال ابن شہاب سے آگے ابن شہاب کا ادراج ہے اور یہاں یہ بات یاد رکھے گا کہ شارحین نے بھی لکھا ہے کہ یہ ابن شہاب کا اس طریقہ کا ادراج ہے، جیسا کہ وہ حدیثوں میں اپنی طرف سے کرتے ہیں۔ میرے نزدیک ابن شہاب نے اگرچہ یہ بات مفید کہی لیکن ہے ان کا ادراج۔

باب: فضل سقی الماء

باب: پانی پینے پلانے کی فضیلت کے بارے میں

❁ حدثنا عبداللہ بن یوسف اخبرنا مالک عن سمی عن ابی صالح عن ابی ہریرۃؓ ان رسول اللہ ﷺ قال بینا رجل یمشی فاشتد علیہ العطش فنزل بئرا فشرب منھا ثم خرج فاذا ھو بکلب یلھث یاکل الثری من العطش فقال لقد بلغ ھذا مثل الذی بلغ بی فملأ خفہ ثم امسکہ بفیہ ثم رقی فسقی الکلب فشکر اللہ لہ فغفر لہ قالوا یا رسول اللہ و ان لنا فی البھائم اجرا قال فی کل کبد رطبۃ اجر تابعہ حماد بن سلمۃ والربیع بن مسلم عن محمد بن زیاد.

ترجمہ:۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک شخص جا رہا تھا، اس کو سخت پیاس لگی وہ ایک کنویں میں اترا اور پانی پیا۔ نکلا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی شدت سے زبان نکالے گیلی مٹی چاٹ رہا ہے۔ اس نے دل میں کہا اس کو بھی پیاس کی ویسی ہی اذیت ہے جیسے مجھ کو تھی۔ اس نے اپنا موزہ پانی سے بھرا اور منہ میں تھام کر اوپر چڑھا اور کتے کو پانی پلایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی اس نیکی کو قبول فرما کر اس کو معاف کر دیا۔ تو لوگوں نے کہا کہ یا رسول اللہ کیا جانوروں کی خدمت میں بھی اجر ہے۔ آپ نے فرمایا ہر وہ جگر جو زندہ ہے اس کی خدمت میں اجر ہے۔

وضاحت:۔ یہ بڑی مبارک حدیث ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے میں یہ دیکھتا ہے کہ اس نے صحیح موقع پر نیکی کے صحیح جذبہ سے مغلوب ہو کر کوئی کام کیا ہے تو اس کا اجر بہت بڑا رکھا ہے۔ ان کو بشارت مل گئی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا۔ یہ کس طرح ملی یہاں اس کا ذکر نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ نے کلیہ بیان فرما دیا کہ ہر جانور جو زندہ جگر رکھتا ہے وہ اسی طرح سے شفقت اور ہمدردی کا محتاج ہے جس طریقہ سے ہم محتاج ہیں۔ انسانیت کا کتنا اعلیٰ معیار ہے کہ جو اسلام پیش کرتا ہے لیکن معلوم نہیں اس زمانے کے لوگوں کے دل و دماغ، ہر چیز کو کیا ہو گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ انسان سے بڑا شقی القلب کوئی نہیں اور اس سے بڑا شریف، عاقل اور فرزانہ بھی کوئی نہیں ہے۔ شیطان بن جائے تو شیطان کے کان کترے اور انسان بن جائے تو جبرئیل کے ہمرکاب ہو جائے۔

❁ حدثنا ابن ابی مریم حدثنا نافع بن عمر عن ابن ابی ملیکۃ عن اسماء بنت ابی بکرؓ ان النبی ﷺ صلی صلوۃ الکسوف فقال دنت منی النار حتی قلت ای رب و انا معھم فاذا امراۃ حسبت انہ قال تخدشھا ھرۃ قال ماشان ھذہ قالوا حبستھا حتی ماتت جوعاً.

ترجمہ:۔ اسماء بنت ابی بکرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے سورج گہن کی نماز پڑھی تو فرمایا کہ دوزخ میرے قریب کی گئی یہاں تک کہ میں نے کہا کہ اے رب! میں بھی ان کے ساتھ ہوں۔ اتنے میں ایک عورت دیکھی۔ میں سمجھتی ہوں آپ نے فرمایا ایک بلی اس کو نوچ رہی تھی۔ آپ نے پوچھا اس کا کیا ماجرا ہے۔ جواب ملا کہ اس نے بلی کو باندھ رکھا تھا یہاں تک کہ وہ بھوک سے مر گئی۔

وضاحت:۔ آنحضرت ﷺ سورج گہن کی نماز پڑھ رہے تھے جس میں آپ کو دوزخ کا مشاہدہ کرایا گیا اور جہنم اتنی قریب لائی گئی کہ اندیشہ کے طور پر آپ نے فرمایا کہ اے رب! میں بھی تو ان کے ساتھ

ہوں؟ انتہائی پریشانی میں یہ بات ہوسکتی ہے جو حضور ﷺ نے فرمائی۔ اس کے بعد آپ نے ایک عورت کو دیکھا کہ بلی اس کو نوچ رہی ہے اس لیے کہ اس عورت نے بلی کو باندھ رکھا تھا یہاں تک کہ بھوک سے وہ مرگئی۔ یہاں سزا بیان ہوئی کہ بلی اس کو نوچے گی۔ ممکن ہے کوئی یہ سوال کرے کہ جزا و سزا کا دن ہوگا تب یہ ہوگا، تو ایسی مثالیں موجود ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو ایسے مشاہدے کرائے گئے جو مستقبل میں پیش آنے والے ہیں۔ معراج کی روایتوں میں ان کا ذکر ہے۔

❁ حدثنا اسمٰعیل قال حدثنی مالک عن نافع عن عبداللہ بن عمرؓ ان رسول اللہ ﷺ قال عذبت امرأۃ فی ھرۃ حبستھا حتی ماتت جوعا فدخلت فیھا النار قال فقال واللہ اعلم لا انت اطعمتیھا ولا سقیتھا حین حبستیھا ولا انت ارسلتیھا فاکلت من خشاش الارض۔

ترجمہ:۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک عورت کو عذاب دیا گیا ایک بلی کے باعث جس کو اس نے باندھ رکھا تھا یہاں تک کہ وہ مرگئی تو اس کے سبب سے وہ عورت دوزخ میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ اللہ جانتا ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اس سے کہا گیا کہ تو نے اس کو کھلایا نہ پلایا جبکہ اس کو تو نے روکے رکھا۔ اس کو چھوڑا بھی نہیں کہ وہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھالیتی۔

وضاحت:۔ یہ روایت وہی ہے جو اسماء بنت ابی بکرؓ نے بیان کی۔ البتہ یہاں اس میں کچھ اضافہ ہوگیا۔ عورت کے جرم کی نوعیت بتارہی ہے کہ اس کی طبیعت اذیت دینے والی ہی تھی اس لیے کہ کوئی شخص اتفاقاً ایسا نہیں کرتا جو اس عورت نے بلی کے ساتھ کیا۔ اس سے آدمی کا مزاج واضح ہوتا ہے۔

یہ واقعہ آنحضرت ﷺ کو دکھایا گیا۔ اس طرح کے جتنے واقعات جزا و سزا سے متعلق روایات میں آئے ہیں امت کی تعلیم و تذکیر کے لیے حضور ﷺ کو مشاہدہ کرائے جاتے تھے۔

باب: من رَای اَنَّ صَاحب الحوضِ والقربۃِ احقُّ بمائِہٖ

باب: ان لوگوں کی رائے جو کہتے ہیں کہ حوض اور مشکیزہ کا مالک اپنے پانی کا زیادہ حقدار ہے

❁ حدثنا قتیبۃ حدثنا عبدالعزیز عن ابی حازم عن سھل بن سعدؓ قال اتی رسول اللہ ﷺ بقدح فشرب و عن یمینہ غلام ھو احدث القوم والا شیاخ عن یسارہ قال یا

غلام اتاذن لی ان اعطی الاشیاخ فقال ما کنت لاوثر بنصیبی منک احدا یا رسول اللہ فاعطاہ ایاہ۔

ترجمہ:۔ سہل بن سعد سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کو ایک پیالہ پیش کیا گیا۔ آپ نے پیا جبکہ آپ کے دہنے ایک لڑکا بیٹھا تھا جو مجلس کے لوگوں میں سب سے کم عمر تھا اور بزرگ لوگ آپ کے بائیں تھے۔ آپ نے کہا لڑکے! کیا تم مجھ کو اجازت دیتے ہو کہ پیالہ میں ان بزرگوں کو دے دوں تو اس نے کہا کہ میں اس حصہ پر جو آپ کی طرف سے میرے نصیب میں ہے کسی کو ترجیح دینے پر راضی نہیں، تو آپ نے پیالہ اس کو دے دیا۔

وضاحت:۔ یہ روایت اوپر گزر چکی ہے۔ لڑکے نے بلاشبہ بہت عمدہ بات کہی ہے۔ لیکن کیا اس لڑکے کو جو آنحضرت ﷺ نے دیا اور ایک حوض یا مشکیزہ کے مالک کو اپنے پانی پر جو حق حاصل ہے تو یہ دونوں حق ایک سے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کی رائے یہی ہے جب ہی تو باب کے بعد یہ روایت لائے ہیں۔

مشکیزہ کے پانی کا مالک، بہرحال مالک ہے۔ چاہے وہ نہر سے لایا ہو یا کنویں سے لایا ہو، لیکن یہاں آنحضرت ﷺ نے لڑکے کو جو دیا تو آداب کی تعلیم کے لیے دیا ہے کہ الایمن فالایمن کا اصول مجلس میں پیش نظر رہنا چاہیے۔ یعنی دائیں جانب جو جتنا قریب ہے وہ اتنا ہی زیادہ حق دار ہے۔ لڑکے نے بھی بات لاجواب کی اور اس کو حضور ﷺ کا عطیہ سمجھا۔ اس کو ملکیت نہیں سمجھا ہے۔ اگر امام صاحب نے ایسا سمجھا ہے تو یہ ان کی طرف سے ہے۔ ابواب تراجم کے پہلو سے اس کی کوئی اہمیت نہیں، البتہ روایت کی اہمیت ہے۔

❁ حدثنا محمد بن بشار حدثنا غندر حدثنا شعبۃ عن محمد بن زیاد سمعت اباھریرۃ عن النبی ﷺ والذی نفسی بیدہ لا ذودن رجالا عن حوضی کما تذاد الغریبۃ من الابل عن الحوض۔

ترجمہ:۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا قسم اس ذات کی جس کی مٹھی میں میری جان ہے، قیامت کے دن میں اپنے حوض سے بہت سارے لوگوں کو اس طرح دفع کروں گا جس طرح پرائے اونٹ حوض پر سے ہانک دیے جاتے ہیں۔

وضاحت:۔ یعنی حوض کا مالک اپنے اونٹ کو پانی پلاتا ہے اور کوئی دوسرا اونٹ لپک کر آنا چاہے تو حوض والے کو حق ہے کہ اس کو ہانک دے۔ قیامت کے حوض سے مراد حوض کوثر ہے اور قیامت کے دن

آنحضرت ﷺ اپنی امت کے نیک لوگوں کا خیر مقدم کریں گے اور جو اجنبی اور ناکارہ لوگ مدعی بنیں گے تو آپ کہہ دیں گے کہ یہ میری امت میں نہیں ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے لیے بڑا شرف ہے لیکن حوض کا مالک تو اللہ ہی ہے جو ہر چیز کا مالک ہے۔ باب کے حوالہ سے امام صاحب اس روایت سے وہ بات نکالنا چاہتے ہیں جو نکلتی نہیں۔

❁ حدثنا عبداللہ بن محمد اخبرنا عبدالرزاق اخبرنا معمر عن ایوب و کثیر ابن کثیر یزید احدھما علی الاخر عن سعید بن جبیر قال قال ابن عباسؓ قال النبی ﷺ یرحم اللہ ام اسمعیل لو ترکت زمزم او قال لو لم تغرف من الماء لکانت عینا معینا و اقبل جرھم فقال اتاذنین ان ننزل عندک قالت نعم و لا حق لکم فی الماء قالوا نعم۔

ترجمہ:۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ام اسمٰعیل پر رحم کرے۔ اگر وہ زم زم کو چھوڑ دیتیں اور اس میں سے چلو بھر بھر کے پانی نہ لیتیں تو وہ ایک جاری چشمہ ہوتا۔ اور جرہم قبیلہ کے لوگ ان کے پاس آئے اور پوچھا کیا تم اجازت دیتی ہو کہ ہم یہاں ٹھہریں تو انہوں نے کہا ہاں، لیکن پانی میں تمہارا کوئی دعویٰ نہ ہوگا۔ تو انہوں نے کہا بے شک۔

وضاحت:۔ روایت کی رو سے زمزم حضرت جبریل کی ٹھوکر سے جاری ہوا تھا۔ اور ام اسماعیل ہی کا تھا۔ جرہم قبیلہ کے لوگوں سے ام اسمٰعیل نے کہا تم لوگ یہاں ٹھہر تو سکتے ہو لیکن پانی پر تمہارا کوئی دعویٰ نہیں ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت زم زم کی شکل یہ تھی کہ وہ جاری پانی نہیں بنا تھا اور محدود تھا۔ چونکہ جرہم کے لوگ معاملہ کی اہمیت سے واقف تھے اس لیے انہوں نے ام اسمٰعیل کے حق کو تسلیم کیا۔ ام اسمٰعیل نے اس ڈر سے کہ کہیں پانی ختم نہ ہو جائے چلو بھر بھر کر کسی برتن یا مشکیزہ میں پانی جمع کر لیا ہوگا۔ آنحضرت ﷺ کا یہ کہنا کہ انہوں نے خواہ مخواہ کو پانی محفوظ کرنے کی کوشش کی، اس کو چھوڑ دیتیں تو یہ ایک جاری چشمہ ہوتا، اسی سے متعلق معلوم ہوتا ہے۔ بعد میں زم زم بہت ترقی کر گیا اور اب تو یہ ہے کہ روزانہ لاکھوں آدمی اس سے سیراب ہوتے ہیں۔

❁ حدثنا عبداللہ بن محمد حدثنا سفیان عن عمرو عن ابی صالح السمان عن ابی ھریرةؓ عن النبی ﷺ قال ثلثة لا یکلمھم اللہ یوم القیامة و لا ینظر الیھم رجل حلف علی سلعة لقد اعطی بھا اکثر ما اعطی وھو کاذب و رجل حلف علی یمین کاذبة بعد العصر لیقطع بھا مال رجل مسلم و رجل منع فضل ماء فیقول اللہ الیوم امنعک فضلی کما منعت فضل مالم تعمل یداک قال علی حدثنا سفیان غیر مرة عن عمرو

سمع ابا صالح یبلغ بہ النبی ﷺ۔

ترجمہ:۔ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ تین شخص ایسے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سے بات بھی نہیں کرے گا اور نہ ان کی طرف نظر اٹھائے گا۔ ایک وہ شخص جو قسم کھائے کسی شے کے متعلق کہ اس نے اس کے خریدنے کے اوپر اس سے بہت زیادہ رقم دی ہے جتنی کہ واقعی اس نے دی ہو۔ دوسرا وہ شخص جو عصر کے بعد جھوٹی قسم کھائے کسی مسلمان مرد کا مال ہڑپ کرنے کو، اور تیسرا وہ شخص کہ جو فالتو پانی روکے رکھے۔ اللہ تعالیٰ اس دن کہے گا کہ میں اپنا فضل آج تجھ سے روکوں گا جیسا کہ تو نے اس چیز کا فضل روکا تھا جس کو کہ تیرے ہاتھوں نے نہیں بنایا تھا۔

وضاحت:۔ یہ روایت گزر چکی ہے اور اس کی وضاحت وہاں ہو چکی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ وہاں بعد العصر کے الفاظ قسم کھا کر مال بیچنے والے کے بارے میں ہیں جس کا ذکر یہاں اس روایت میں پہلے ہوا ہے۔ یعنی وہ آدمی عصر کے بعد قسم کھائے کہ اس نے اس مال کے خریدنے میں بہت زیادہ رقم دی ہے جتنی کہ واقعی اس نے دی ہو اور اس کو کوئی دوسرا سچ سمجھ کر دھوکا کھا جائے۔ وہاں بعد العصر کا لفظ بہت موزوں ہے۔ یہاں کسی راوی نے یہ لفظ دوسرے شخص سے متعلق کر دیا ہے جو کسی طرح موزوں نہیں۔ کسی کے مال پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے جھوٹی قسم کھانے کا کوئی خاص وقت معین نہیں ہوتا۔ وہ ہر وقت کھائی جا سکتی ہے۔

اوپر والی روایت میں تیسرا شخص اپنے مفادات کے تحت امام کی بیعت کرنے والا بتایا گیا تھا۔ یہاں اس کے بجائے فالتو پانی روکنے والے کو اللہ تعالیٰ کی نظروں میں قابل نفرت بتایا گیا ہے جو اللہ کی دی ہوئی چیز میں سے کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے میں تنگ دلی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ روایت میں راوی حضرات اس طرح کی تبدیلیاں کر دیتے ہیں۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ ہر روایت بالکل انہی الفاظ میں حدیث کی کتابوں یا صحیحین میں نقل ہوئی ہے جیسے صحابی نے اسے بیان کیا تھا، ایک خام خیال ہے۔

(ترتیب: سید اسحاق علی)

درس موطا امام مالک

(۱۰) باب: مَاجَاءَ فِي الرعاف

باب: وہ روایات جو نکسیر پھوٹنے کے بارے میں ہیں

۱۔ حَدَّثَنِي يَحيى عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ إِذَا رَعَفَ انْصَرَفَ فَتَوَضَّأَ ثُمَّ رَجَعَ فَبَنى وَلَمْ يَتَكَلَّمْ.

ترجمہ:۔ نافع بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرؓ کو جب نکسیر پھوٹتی تو وہ لوٹتے، وضو کرتے، پھر واپس آتے اور وہیں سے نماز شروع کرتے۔ البتہ اس بیچ میں کوئی بات نہیں کرتے تھے۔

وضاحت:۔ فَبَنٰی: پھر اس پر بنا رکھتے۔ مراد یہ ہے کہ از سر نو نماز شروع کرنے کے بجائے وہیں سے سلسلہ جوڑتے جہاں نکسیر پھوٹنے سے منقطع ہوا تھا۔ یعنی ان کی یہ حالت گویا نماز ہی کی حالت ہوتی تھی۔ اسی لیے اس کے دوران میں کوئی بات نہیں کرتے تھے تاکہ نماز کا تسلسل قائم رہے۔

۲۔ وَحَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَزِيدَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ قُسَيْطٍ اللَّيْثِيِّ اَنَّهُ رَاَى سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ رَعَفَ وَهُوَ يُصَلِّي فَاَتَى حُجْرَةَ اُمِّ سَلَمَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ فَاُتِيَ بِوَضُوْءٍ فَتَوَضَّأَ ثُمَّ رَجَعَ فَبَنٰى عَلٰى مَا قَدْ صَلّٰى.

ترجمہ:۔ یزید بن عبداللہ بن قسیط لیثیؒ کہتے ہیں کہ انہوں نے سعید بن میسب کو دیکھا کہ ان کی نکسیر پھوٹی جبکہ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ تو وہ نبی ﷺ کی زوجہ حضرت ام سلمہؓ کے حجرے میں آئے۔ وضو کے لیے پانی لایا گیا تو انہوں نے وضو کیا۔ پھر وہ لوٹے اور وہیں سے نماز شروع کی جہاں تک وہ پڑھ چکے تھے۔

وضاحت:۔ عبداللہ بن عمرؓ اور سعید بن المسیب کے عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ نکسیر کا پھوٹنا ناقض وضو ہے۔ البتہ یہ ہے کہ اگر نماز کے دوران میں یہ بات ہوئی ہے تو خون نکلنے سے پہلے کے ادا شدہ حصے کے اعادے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ وہیں سے آپ اپنی نماز پوری کر سکتے ہیں جہاں آپ نے نماز چھوڑی تھی۔

۳۔ وَحَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عَبَّاسٍ كَانَ يَرْعُفُ فَيَخْرُجُ فَيَغْسِلُ الدَّمَ عَنْهُ ثُمَّ يَرْجِعُ فَيَبْنِي عَلٰى مَا قَدْ صَلّٰى.

ترجمہ:۔ امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ عبداللہ بن عباسؓ کو جب نکسیر پھوٹتی تو وہ نکلتے، خون دھو لیتے، پھر وہ لوٹتے تو اسی نماز کو پوری کرتے جہاں سے انہوں نے ختم کی ہوتی۔

وضاحت:۔ اس روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نکسیر پھوٹنے کی صورت میں نماز کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ خون صاف کرنا کافی سمجھتے اور نیا وضو نہ کرتے۔

(۱۱) باب العمل فی الرعاف

باب: نکسیر پھوٹنے کے حوالے سے طرز عمل

۱۔ حَدَّثَنِي يَحيى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ حَرْمَلَةَ الاَسْلَمِيِّ اَنَّهُ قَالَ: رَاَيْتُ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ يَرْعُفُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الدَّمُ حَتّٰى تَخْتَضِبَ اَصَابِعُهُ مِنَ الدَّمِ الَّذِي يَخْرُجُ مِنْ اَنْفِهِ ثُمَّ يُصَلِّي وَلَا يَتَوَضَّأُ.

ترجمہ:۔ عبدالرحمن بن حرملہ اسلمیؒ کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن میسبؒ کو دیکھا کہ ان کی نکسیر پھوٹتی تو خون ان سے نکلتا یہاں تک کہ ان کی انگلیاں اس خون سے رنگین ہو جاتیں جو ان کی ناک سے نکلتا۔ پھر وہ نماز پڑھتے اور وضو نہیں کرتے تھے۔

۲۔ وَحَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ الْمُجَبَّرِ اَنَّهُ رَاَى سَالِمَ بْنَ عَبْدِاللّٰهِ يَخْرُجُ مِنْ اَنْفِهِ الدَّمُ حَتّٰى تَخْتَضِبَ اَصَابِعُهُ ثُمَّ يَفْتِلُهُ ثُمَّ يُصَلِّي وَلَا يَتَوَضَّأُ.

ترجمہ:۔ عبدالرحمن بن مجبر بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے سالم بن عبداللہؒ کو دیکھا کہ ان کی ناک سے خون نکلتا یہاں تک کہ ان کی انگلیاں رنگین ہو جاتیں۔ پھر وہ اس کو مل دیتے، پھر نماز پڑھتے اور وضو نہ کرتے۔

وضاحت:۔ ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ نکسیر کے خون کی رنگینی کو محض مل دینا کافی ہے اس کے لیے وضو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ محض خون سے رنگین ہو جانا دم جاری کے حکم میں داخل نہیں ہے۔

(۱۲) باب العمل فیمن غلبه الدم من جرح او رعاف

باب: زخم یا نکسیر سے مسلسل خون جاری رہنے والے شخص کے بارے میں

۱۔ حَدَّثَنِي يَحيى عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيهِ اَنَّ الْمِسْوَرَ بْنَ مَخْرَمَةَ اَخْبَرَهُ اَنَّهُ دَخَلَ عَلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ مِنَ اللَّيْلَةِ الَّتِي طُعِنَ فِيهَا. فَاَيْقَظَ عُمَرَ لِصَلَاةِ الصُّبْحِ. فَقَالَ عُمَرُ: نَعَمْ وَلَا حَظَّ فِي الْاِسْلَامِ لِمَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ فَصَلّٰى عُمَرُ وَجُرْحُهُ يَثْعَبُ دَمًا.

ترجمہ: مسور بن مخرمہؓ روایت کرتے ہیں کہ وہ حضرت عمر بن خطابؓ کے پاس اس رات، جس میں وہ زخمی ہوئے، آئے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کو نماز فجر کے لیے جگایا تو حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا کہ بے شک! جس نے نماز ترک کر دی اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ پس حضرت عمرؓ نے اس حالت میں نماز ادا فرمائی کہ ان کے زخموں سے خون برابر جاری تھا۔

وضاحت: یہ روایت فلسفہ دین کے پہلو سے نہایت اہم ہے کہ ادائیگی نماز کا کس قدر اہتمام دین میں مقصود و مطلوب ہے۔ خلیفہ وقت امیر المومنین شدید زخمی ہیں اور اس حالت میں بھی موذن اپنے فرض منصبی کے تحت وقت نماز کی اطلاع دینے آتا ہے اور امیر المومنین نہ صرف یہ کہ اس پر لبیک کہتے ہیں بلکہ باقاعدہ تحسین فرماتے ہیں اور اسلام کے اس بین حکم کی توثیق بھی فرماتے ہیں کہ بے شک جس نے نماز نہیں پڑھی اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ انہوں نے خود اپنے عمل سے اس کو مؤکد کر دیا کہ اس شان سے نماز ادا فرمائی کہ خون زخموں سے برابر جاری تھا۔

موجودہ دور میں حال یہ ہے کہ آپ زندگی بھر نماز نہ پڑھیے پھر بھی آپ مسلم امہ اور قوم کے مسلمہ رہنما اور امام بن سکتے ہیں۔ اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پیش آئے گی۔ اس روایت سے خلافت راشدہ کے دور کے معاشرے کا اور موجودہ معاشرے کا فرق سمجھ میں آئے گا۔ اس دور میں خلیفہ وقت اور مؤذن دونوں کا ذوق کتنا ہم آہنگ تھا۔

۲۔ وَحَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ قَالَ: مَا تَرَوْنَ فِيمَنْ غَلَبَهُ الدَّمُ مِنْ رُعَافٍ فَلَمْ يَنْقَطِعْ عَنْهُ؟ فَقَالَ مَالِكٌ": قَالَ يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ: ثُمَّ قَالَ سَعِيدُ بْنُ الْمُسَيَّبِ: أَرَى أَنْ يُومِئَ بِرَأْسِهِ إِيمَاءً.

قَالَ يَحْيَى: قَالَ مَالِكٌ": وَ ذَلِكَ أَحَبُّ مَا سَمِعْتُ إِلَيَّ فِي ذَلِكَ.

ترجمہ: یحیٰ بن سعیدؒ سے روایت ہے کہ سعید بن مسیب نے پوچھا کہ آپ لوگوں کی اس شخص کے بارے میں کیا رائے ہے، جس کے اوپر نکسیر کے خون کا اتنا غلبہ ہے کہ وہ منقطع نہیں ہوتا۔ مالک کہتے ہیں کہ یحیٰ بن سعیدؒ نے بتایا کہ پھر سعید بن مسیب نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ وہ اپنے سر سے اشارہ کر کے نماز پڑھے۔

یحیٰ کہتے ہیں کہ امام مالک نے کہا کہ اس بارے میں جو کچھ میں نے سنا ہے اس میں یہی سب سے پسندیدہ رائے ہے۔

وضاحت: أَنْ يُومِئَ بِرَأْسِهِ إِيمَاءً۔ یعنی جس طریقہ سے کسی مجبوری کی حالت میں سر زمین پر لگانا مشکل ہو اور آدمی سر جھکا کر اشارہ کرتا ہے تو نکسیر کی صورت میں اشارہ بھی کافی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی شخص کا خون اتنا ہو کہ وہ بند نہیں ہوتا، ہر وقت جاری ہے تب تو بہر حال از روئے قاعدہ وہ معاف ہے، وہ اسی حالت میں نماز پڑھے گا۔ اور اگر صورت استحاضہ جیسی ہو کہ خون بند ہی نہیں ہوتا تو عورت وقت کے وقت خون کو دھوئے گی اور اس کے بعد نماز پڑھے گی اور اس مانع کی مطلق پروا نہیں کرے گی۔ لیکن بہتے خون کو اگر اتنی دیر کے لیے روکا جا سکتا ہے جتنی دیر میں آدمی نماز پڑھ لے تو وہ یہ تدبیر بھی کر سکتا ہے۔ لیکن اس طرح کے حالات میں مجبوراً نماز پڑھنے سے نماز میں کوئی فرق

نہیں پڑے گا۔ تاہم جاری خون کے ناپاک ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ ہاں اگر خون کی مقدار اتنی ہو کہ وہ آسانی کے ساتھ ہاتھ سے رگڑا جا سکے تو وہ بہر حال ناپاک نہیں ہے اور ناقض وضو بھی نہیں ہے۔ بس گوارا ہے۔ اس لیے کہ اسلام میں اتنی سختی نہیں ہے۔

(۱۳) باب الوضوء من المذی

باب: مذی سے وضو ٹوٹنے کے بارے میں

۱۔ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَبِي النَّضْرِ، مَوْلَى عُمَرَ بْنِ عُبَيْدِاللَّهِ عَنْ سُلَيْمَانَ ابْنِ يَسَارٍ عَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ الْأَسْوَدِ أَنَّ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ أَمَرَهُ أَنْ يَسْأَلَ لَهُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَنِ الرَّجُلِ إِذَا دَنَا مِنْ أَهْلِهِ فَخَرَجَ مِنْهُ الْمَذْيُ مَا ذَا عَلَيْهِ. قَالَ عَلِيٌّ": فَإِنَّ عِنْدِي ابْنَةَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَأَنَا أَسْتَحْيِي أَنْ أَسْأَلَهُ. قَالَ الْمِقْدَادُ: فَسَأَلْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَنْ ذَلِكَ فَقَالَ: إِذَا وَجَدَ ذَلِكَ أَحَدُكُمْ فَلْيَنْضَحْ فَرْجَهُ بِالْمَاءِ وَلْيَتَوَضَّأْ وُضُوءَهُ لِلصَّلَاةِ.

ترجمہ: مقداد بن اسود سے روایت ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالبؓ نے ان کو یہ حکم دیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کریں کہ اگر ایک شخص اپنی بیوی سے قریب ہو اور اس سے مذی کا خروج ہو تو وہ کیا کرے؟ حضرت علیؓ نے کہا کہ میرے نکاح میں چونکہ رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی ہیں اس لیے مجھے آپ سے یہ سوال کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مقداد نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں پوچھا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص یہ چیز محسوس کرے تو اپنی شرمگاہ کو پانی سے دھو لے اور نماز کا وضو کرے۔

وضاحت: مَذِی: منی سے الگ وہ تری ہے جس کا خروج اپنے اہل سے ابتدائے قربت میں ہو سکتا ہے۔

مولیٰ: یہ لفظ آزاد کردہ غلام، چچا زاد بھائی، بنی اعمام وغیرہ کے لیے آتا ہے۔ احادیث میں اس کا استعمال زیادہ تر آزاد کردہ غلام کے معنوں میں ہوا ہے۔ عرب معاشرے میں، اسلام کے بعد، غلاموں کے بارے میں جو تدریجی قانون بنایا گیا تھا کہ وہ معاشرے کے جزو بن جائیں تو آزاد کردہ غلام گویا مولیٰ کی حیثیت سے کسی خاندان میں شامل ہو جاتا تھا۔ یعنی خاندان کے جس شخص نے اس کو آزاد کیا ہوتا تھا تو وہ قانونی طور پر اس کے موالی میں سے مولیٰ سمجھا جاتا تھا۔ اگر اس کا کوئی وارث نہ ہوتا تو اس کی موت کی شکل میں وہی لوگ وارث بھی ہوتے تھے اور کفن دفن کی ذمہ داریاں بھی نبھاتے تھے۔ اس لیے کہ وہ مولیٰ کی حیثیت سے اس خاندان کا جائز فرد بن جاتا تھا۔

اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ مذی کا خروج ناقض وضو تو ہے مگر ناقض غسل نہیں ہے۔

اس روایت میں لفظ فرج یعنی شرمگاہ مردوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ عربی میں اس کا استعمال مردوں کے لیے بھی ہوتا ہے۔ اس کو جاننا اس لیے ضروری ہے کہ قرآن مجید میں بعض جگہ لوگوں کو اسلوب ناتراشیدہ سا معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ معلوم ہو کہ مردوں کے لیے بھی یہ لفظ آتا ہے تو اسلوب میں چنداں مغائرت محسوس نہیں ہوتی۔

فَلْيَنْضَحْ (تو دھولے) نضح کا لفظ صرف پانی چھڑکنے کے لیے ہی نہیں آتا بلکہ دھونے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور یہاں حدیث کے استعمال میں یہی مفہوم ہے کہ پانی سے دھولے اور اس کے بعد وضو کرلے۔ یعنی وہ وضو کہ جو نماز کے لیے کیا جاتا ہے۔

۲۔ وَحَدَّثَنِيْ عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِبْنِ اَسْلَمَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ: اِنِّي لَاَجِدُهُ يَنْحَدِرُ مِنِّيْ مِثْلَ الْخُرَيْزَةِ. فَاِذَا وَجَدَ ذٰلِكَ اَحَدُكُمْ فَلْيَغْسِلْ ذَكَرَهُ، وَلْيَتَوَضَّأْ وُضُوْءَهُ، لِلصَّلَاةِ يَعْنِي الْمَذْيَ.

ترجمہ: زید بن اسلم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ میں خود محسوس کرتا ہوں کہ بعض مرتبہ ہار کے موتیوں کے مانند، یہ چیز مجھ سے بھی گرتی ہے (ان کی مراد مذی سے تھی) تو جب تم میں سے کوئی اس کا احساس کرے تو چاہیے کہ وہ اپنے عضو تناسل کو دھولے اور وضو کرلے، وہ وضو جو کہ نماز کا ہوتا ہے۔

وضاحت: فَلْيَغْسِلْ: دیکھیے یہاں فَلْيَنْضَحْ کے بجائے اس کو فَلْيَغْسِلْ کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ دونوں مفہوم ادا کرنے کے لیے آتا ہے۔

۳۔ وَحَدَّثَنِيْ عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِبْنِ اَسْلَمَ عَنْ جُنْدُبٍ. مَوْلٰى عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَيَّاشٍ اَنَّهُ، قَالَ: سَاَلْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ عَنِ الْمَذْيِ فَقَالَ: اِذَا وَجَدْتَهُ، فَاغْسِلْ فَرْجَكَ وَتَوَضَّأْ وُضُوْءَكَ لِلصَّلَاةِ.

ترجمہ: جندبؓ جو کہ عبداللہ بن عیاش کے آزاد کردہ غلام ہیں، سے روایت ہے کہ میں نے عبداللہ بن عمرؓ سے مذی کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ جب تم یہ چیز محسوس کرو تو اپنی شرمگاہ کو دھولیا کرو اور نماز کا وضو کرلیا کرو۔

وضاحت: یہاں تائید مزید کے طور پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا مسلک بھی بیان کر دیا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مذی کے معاملے میں اس سے زیادہ کی پابندی نہیں ہے۔

(۱۴) باب الرخصة فی ترک الوضو من الودی

باب: خروج ودی میں وضو سے استثناء کا بیان

۱۔ حَدَّثَنِيْ يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ اَنَّهُ، سَمِعَهُ، وَرَجُلٌ" يَسْاَلُهُ، فَقَالَ: اِنِّي لَاَجِدُ الْبَلَلَ وَ اَنَا اُصَلِّيْ اَفَاَنْصَرِفُ؟ فَقَالَ لَهُ، سَعِيْدٌ": لَوْ سَالَ عَلٰى فَخِذِيْ مَاانْصَرَفْتُ حَتّٰى اَقْضِيَ صَلَاتِيْ.

ترجمہ: یحییٰ بن سعید بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے سعید بن مسیب سے سنا جب ایک شخص ان سے پوچھ رہا تھا کہ میں نماز پڑھتے ہوئے تری محسوس کرتا ہوں تو کیا میں نماز سے ہٹ جاؤں؟ تو سعیدؒ نے اس سے کہا کہ اگر میری رانوں کے اوپر وہ بہہ بھی جائے جب بھی میں نماز نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ میں اپنی نماز پوری کرلوں۔

وضاحت: اَلْوَدْیُ: وَدِی اس تری کو کہتے ہیں کہ جو پیشاب کر کے اٹھنے کے بعد آدمی محسوس کرتا ہے جیسے کہ پیشاب کے قسم کی کوئی چیز خارج ہوئی ہو۔

افانصرف: یعنی اس صورت میں نماز چھوڑ دوں؟

وَدِی کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً بعض لوگوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرینے سے پیشاب کے لیے بیٹھے نہیں اور چند قطرے پوری طرح سے خارج ہونے سے رہ گئے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اٹھنے کے بعد گویا خارج ہو گئے ہیں۔ دوسری شکل میں مثانے کی کمزوری کی وجہ سے یہ بیماری ہو جاتی ہے۔ تیسری صورت بڑھاپے کے نتیجے میں پیدا ہو جاتی ہے اور چوتھی صورت میں اس کا حقیقی وجود تو نہیں ہوتا مگر بعض لوگوں کو اس کا وسوسہ ہوتا ہے۔ تو اس باب کی روایات میں ان امور کو بیان کیا گیا ہے۔

لَوْ سَالَ عَلٰى فَخِذِيْ مَاانْصَرَفْتُ حَتّٰى اَقْضِيَ صَلَاتِيْ. اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعید بن مسیب کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ اس تری کو ناقض وضو نہیں مانتے تھے اور نہ اس کو اہمیت دیتے تھے۔ جمہور علماء کا اس معاملے میں جو مذہب ہے وہ بہت عقلی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ودی کے قطرے پیشاب ہیں اور پیشاب بہر صورت ناقض وضو ہے تو ودی بھی ناقض وضو ہے۔ یہ اس حکم سے مستثنیٰ کیسے ہو سکتی ہے؟

۲۔ وَحَدَّثَنِيْ عَنْ مَالِكٍ عَنِ الصَّلْتِ بْنِ زُيَيْدٍ اَنَّهُ، قَالَ: سَاَلْتُ سُلَيْمَانَ بْنَ يَسَارٍ عَنِ الْبَلَلِ اَجِدُهُ، فَقَالَ: انْضَحْ مَا تَحْتَ ثَوْبِكَ بِالْمَاءِ وَالْهُ عَنْهُ.

ترجمہ: صلت بن زبید سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے سلیمان بن یسار سے اس تری کے بارے میں مسئلہ پوچھا جس کو میں محسوس کروں تو انہوں نے جواب دیا کہ جو کچھ تمہارے کپڑے کے نیچے

ہے اس کو پانی سے دھو دو اور اس سے بے پروا ہو جاؤ۔

وضاحت: میرا خیال یہ ہے کہ سلیمان بن یسارؒ نے جو جواب دیا ہے وہ مخاطب کے لحاظ سے دیا ہے۔ جب آدمی اپنے کسی عزیز کے عارضہ کو جانتا ہو تو کہہ دیتا ہے کہ اگر شکل یہ ہے تو دھو دو اور اس سے غافل ہو جاؤ۔ یعنی اس کی پروا نہ کرو۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر حالت میں ایسا ہی کرو۔ عام حالات کے لیے جمہور کا مذہب ہی صائب معلوم ہوتا ہے۔

اس صورت میں میرے نزدیک ایک شکل تو وسوسے کی ہے، ایک شکل بیماری کی اور ایک نالائقی اور جلد بازی کی ہے۔ بہت سے لوگ پیشاب کرنے کے لیے قرینے سے نہیں بیٹھتے۔ پیشاب سے پوری طرح فارغ ہونے کے لیے ایک تو یہ بات ضروری ہے کہ آدمی قرینے سے بیٹھے۔ بعض مرتبہ نشست ٹھیک نہیں ہوتی اور اس معاملہ میں آدمی کی عادتیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ آدمی کو اندازہ ہونا چاہیے کہ کس طریقہ سے بیٹھ کے پوری طرح اطمینان قلب کے ساتھ پیشاب سے فارغ ہو سکتا ہے۔ اگر یہ صورت حال جلد بازی کا نتیجہ ہے تو آدمی کو اپنی تربیت کرنی چاہیے۔ اگر ودی کا سبب بیماری ہے تو پھر بیماری عفو ہے۔ یعنی اس سے درگزر کیا جائے گا۔ اور اگر وہم ہے تو یہ نفسیاتی عارضہ ہے اس کا بھی مداوا ہونا چاہیے۔ میں اس وہم کے مریضوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں جیسے یوگا کی ورزشوں کا مظاہرہ کر رہے ہوں۔ دوسروں کو شرم آتی ہے۔ میں نے بعض لوگوں کو ٹوکا بھی کہ اس طرح کی ناشائستہ حرکتیں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اگر آپ کو عارضہ ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معاف ہے۔

احناف اس کو ناقض وضو مانتے ہیں تو ناقض وضو اس شکل میں ہے جبکہ ایک شخص جلد بازی یا بے قاعدگی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے۔ باقی رہ گیا کہ اگر یہ بیماری ہے یا عمر کا تقاضا ہے تب یہ معاف ہے۔ تو اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ اس تنقیح کے ساتھ یہ مسلک میرے نزدیک صحیح ہے۔

(۱۵) باب : الوضوء من مس الفرج

باب: عضو کے چھونے سے وضو کا ضروری ہو جانا

۱۔ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ أَبِي بَكْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ أَنَّهُ سَمِعَ عُرْوَةَ بْنَ الزُّبَيْرِ يَقُولُ: دَخَلْتُ عَلَى مَرْوَانَ بْنِ الْحَكَمِ فَتَذَاكَرْنَا مَا يَكُونُ مِنْهُ الْوُضُوءُ. فَقَالَ مَرْوَانُ: وَمِنْ مَسِّ الذَّكَرِ الْوُضُوءُ. فَقَالَ عُرْوَةُ: مَا عَلِمْتُ هٰذَا. فَقَالَ مَرْوَانُ ابْنُ الْحَكَمِ: أَخْبَرَتْنِي بُسْرَةُ بِنْتُ صَفْوَانَ أَنَّهَا سَمِعَتْ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: إِذَا مَسَّ أَحَدُكُمْ ذَكَرَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ.

ترجمہ: عبداللہ بن ابی بکرؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے عروہ بن زبیرؒ سے سنا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں مروان بن حکم کے پاس گیا تو ہم اس مسئلے پر بحث کرنے لگے کہ وضو کن چیزوں سے ضروری ہو جاتا ہے؟ مروان نے یہ کہا کہ آدمی اگر اپنے عضو کو ہاتھ لگا دے تو اس کے چھونے سے وضو ضروری ہو جاتا ہے۔ اس پر عروہؒ نے کہا کہ مجھے تو یہ بات معلوم نہیں۔ تو مروان بن حکم نے کہا کہ مجھے بسرہ بنت صفوانؓ نے یہ خبر دی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا۔ آپ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی اپنے عضو کو ہاتھ لگا دے تو چاہیے کہ وہ وضو کرے۔

وضاحت: احناف کا مذہب -- عضو کو ہاتھ لگانے اور لزوم و عدم لزوم وضو کے مسئلے میں -- یہ ہے کہ وہ عضو کو مضغة من جسد قرار دیتے ہیں۔ یعنی وہ بھی دیگر اعضائے بدن کی طرح جسم کا ایک حصہ ہے، اس کو چھونے سے وضو کیوں ضروری ہو جائے گا۔ ایسی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اعادہ وضو کیا جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس روایت کا کیا مطلب ہے؟ شاہ ولی اللہ نے ایک نکتہ پیدا کیا ہے لیکن اس کی نوعیت نکتہ باردہ کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مس ذکر پیشاب کی تعبیر ہے۔ لیکن کنایات وغیرہ کے متعلق زبان میں استعمالات ہوتے ہیں۔ یہ کنایہ تو ہمارے علم میں نہیں ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ شاہ صاحب نے بھی محض روایت کا ایک محمل بتانے کے لیے یہ کہا ہے، ورنہ یہ کوئی بات نہیں ہے۔

۲۔ وَحَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ إِسْمَاعِيلَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ عَنْ مُصْعَبِ ابْنِ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ أَنَّهُ قَالَ. كُنْتُ أُمْسِكُ الْمُصْحَفَ عَلَى سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ فَاحْتَكَكْتُ فَقَالَ سَعْدٌ: لَعَلَّكَ مَسِسْتَ ذَكَرَكَ؟ قَالَ: فَقُلْتُ: نَعَمْ. فَقَالَ: قُمْ فَتَوَضَّأْ فَقُمْتُ فَتَوَضَّأْتُ ثُمَّ رَجَعْتُ.

ترجمہ: مصعب بن سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں سعد بن ابی وقاصؓ کے پاس مصحف لے کر کھڑا ہوا تھا کہ میں نے اپنا بدن کھجلایا۔ سعدؓ نے کہا کہ شاید تم نے اپنے عضو کو ہاتھ لگایا ہے؟ کہتے ہیں میں نے کہا کہ ہاں! یہ تو ہوا ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ اٹھو اور جا کے وضو کرو۔ تو میں نے وضو کیا اور پھر میں آیا۔

وضاحت: اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص کا مزاج بھی، حضرت عبداللہ بن عمرؓ -- جو گویا متشددین اور محتاطین کے امام ہیں -- اور اس قبیل کے دوسرے لوگوں کی طرح کا ہے۔ یعنی ان پر بھی دین میں احتیاط کا غلبہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تورع کی بنا پر بعض لوگوں کا یہ ذوقی مذہب رہا ہے کہ وہ عضو کو ہاتھ لگانے کے بعد وضو کرنے کے قائل تھے۔ لوگ بہت سی چیزیں تورع یا احتیاط کی بنا پر اختیار کرتے ہیں لیکن اس سے تشدد پیدا ہو گیا ہے۔ ان کا طرز عمل ان کے ذاتی ذوق کے لیے تو موزوں ہے لیکن یہ عام فقہ

نہیں بن سکتا۔ اس مسئلے میں میرے خیال میں یہی توجیہ مناسب ہے۔ شاہ صاحب کا نکالا ہوا حل مجھے اپیل نہیں کرتا۔ اس معاملے میں حنفیہ کا مذہب صاف ہے کہ عضو جزو بدن ہے، اس کو ہاتھ لگانا ناقض وضو کہاں سے ہو گیا۔ حنفیہ کے مذہب کو جو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض استثنائی معاملات کے علاوہ ہر چیز میں اور ہر باب میں ان کے مذہب میں عقلیت ہے، سہولت ہے اور عام فقہ کے لیے یہی چیز موزوں ہے۔ البتہ شکی، متورع یا محتاط یا متشدد آدمی کے لیے یہ مذہب نہیں ہے۔ ان کا مذہب الگ ہے۔

ایک توجیہ یہ بھی کی گئی ہے کہ جب آدمی کا ہاتھ کپڑے کے اوپر سے لگے یعنی بیچ میں کپڑا حائل ہو تو پھر وضو کرنے کی ضرورت نہیں۔ کپڑے کے اوپر سے ہاتھ لگنے پر تو کسی کے ہاں بھی بحث نہیں پیدا ہونی چاہیے۔ لیکن میں اس توجیہ کو بھی نہیں مانتا کیونکہ اس صورت میں بھی وضو کو حکم واجب مان لیا گیا ہے حالانکہ اس کی یہ حیثیت نہیں ہے۔

۳۔ وَحَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ يَقُولُ: إِذَا مَسَّ أَحَدُكُمْ ذَكَرَهُ فَقَدْ وَجَبَ عَلَيْهِ الْوُضُوءُ۔

ترجمہ: نافع سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ فرماتے تھے کہ جب تم میں سے کوئی اپنے عضو کو ہاتھ لگا دے تو اس کے اوپر وضو واجب ہو جاتا ہے۔

۴۔ وَحَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ أَنَّهُ يَقُولُ: مَنْ مَسَّ ذَكَرَهُ فَقَدْ وَجَبَ عَلَيْهِ الْوُضُوءُ۔

ترجمہ: ہشام بن عروہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ وہ کہتے تھے کہ جس نے اپنے عضو کو چھوا تو اس پر وضو واجب ہے۔

وضاحت: وَجَبَ عَلَيْهِ الْوُضُوءُ۔ دیکھیے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور عروہ بن زبیرؓ دونوں نے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ انہوں نے اپنی دوٹوک رائے کا اظہار کر دیا ہے کہ اس صورت میں وضو لازم ہوگا۔

۵۔ وَحَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ أَنَّهُ قَالَ: رَأَيْتُ أَبِي عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ يَغْتَسِلُ ثُمَّ يَتَوَضَّأُ. فَقُلْتُ لَهُ: يَا أَبَتِ! أَمَا يُجْزِيكَ الْغُسْلُ مِنَ الْوُضُوءِ؟ قَالَ: بَلَى وَلَكِنِّي أَحْيَانًا أَمَسُّ ذَكَرِي فَأَتَوَضَّأُ۔

ترجمہ: سالم بن عبداللہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے باپ، عبداللہ بن عمر کو دیکھا کہ وہ غسل کر رہے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے وضو کیا تو میں نے کہا کہ اے والد ماجد! کیا آپ کا غسل وضو کے لیے کافی نہیں ہوا ہے تو انہوں نے کہا کہ ہاں! مگر کبھی کبھی میں اپنے عضو کو ہاتھ لگا دیتا ہوں تو میں اس کے بعد وضو کر لیتا ہوں۔

وضاحت: يَا أَبَتِ اصل میں يَا أَبِي ہے یعنی اے والد ماجد: بعض لوگوں کے نزدیک اس ترکیب میں ی حرف ت سے بدل جاتی ہے۔ ی اور ت میں بظاہر کوئی مناسبت نہیں ہے کہ یہ تبدیلی آئے۔ اصل میں ت حرف خطاب ہے۔ اس لیے میرے نزدیک ی، ت سے بدل نہیں جاتی بلکہ ت مخاطب کرنے کے لیے آتی ہے۔ مگر یہ سب میرے قیاسات ہی ہیں۔

اس روایت میں بھی تشدد کا پہلو نمایاں ہے۔ دیکھیے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو اپنے غسل کے اوپر بھی اطمینان نہیں ہوا۔

جب آپ جان جائیں کہ فلاں فلاں شخص کا دین میں کیا مذاق ہے تب آپ مسائل میں صحیح رائے قائم کر سکتے ہیں ورنہ چکر میں پڑ جائیں گے۔ واضح طور پر یہ جاننا ضروری ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، اور دیگر فقیہ صحابہؓ کا کیا ذوق ہے۔ یہی تو وہ لوگ ہیں کہ جن کے ہاتھوں میں پورے دین کی باگ ہے۔

۶۔ وَحَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ أَنَّهُ قَالَ كُنْتُ مَعَ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ فِي سَفَرٍ فَرَأَيْتُهُ بَعْدَ أَنْ طَلَعَتِ الشَّمْسُ تَوَضَّأَ ثُمَّ صَلَّى قَالَ فَقُلْتُ لَهُ: إِنَّ هَذِهِ لَصَلَاةٌ مَا كُنْتَ تُصَلِّيهَا. قَالَ: إِنِّي بَعْدَ أَنْ تَوَضَّأْتُ لِصَلَاةِ الصُّبْحِ مَسِسْتُ فَرْجِي. ثُمَّ نَسِيتُ أَنْ أَتَوَضَّأَ فَتَوَضَّأْتُ وَعُدْتُ لِصَلَاتِي.

ترجمہ: سالم بن عبداللہ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ ایک سفر میں تھا۔ میں نے دیکھا کہ جب سورج نکل آیا تو انہوں نے وضو کیا پھر نماز پڑھی۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ تو ایسی نماز ہے کہ آپ پہلے نہیں پڑھتے تھے۔ تو انہوں نے کہا کہ ہاں! صبح کی نماز کے لیے وضو کے بعد میں نے اپنے عضو کو ہاتھ لگا دیا تھا۔ پھر میں وضو کرنا بھول گیا۔ تو میں نے وضو کیا اور اپنی نماز دہرائی ہے۔

وضاحت: اس روایت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس طرز عمل میں تقویٰ جتنا چاہے ہو، فقاہت بہر حال نہیں ہے۔ یہ روایت گویا واضح طریقے سے ثابت کر دیتی ہے کہ اس معاملے میں حضرت عبداللہ بن عمر بہت متشدد ہیں۔ یہ ایک ایسی شہادت ہے کہ جس کے بعد کسی اور شہادت کی ضرورت نہیں ہے۔

(ترتیب: ماجد خاور)

خالد مسعود

رسول اللہؐ کے فرائض اور ذمہ داریاں

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں انبیاء علیہم السلام کی پیشگوئیوں اور خود آپ کی تئیس سالہ جدوجہد پر آدمی کی نظر ہو تو آپ کے فرائض اور ذمہ داریوں کو سمجھنے میں اس کو کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ اس کے باوجود غیر مسلموں میں تو کجا، خود مسلمانوں میں ان کا شعور بے حد کم ہے۔ غیر مسلموں کا معاملہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ اگر وہ حضورؐ کو اللہ کا پیغام لانے والا رسول مان لیں تو ان کو اپنے ہر عقیدہ و فعل پر نظر ثانی کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا وہ تو آپ کی ذات والا صفات میں جب تک عیوب و نقائص ثابت نہ کریں اس وقت تک انھیں چین نہیں آتا۔ لیکن مسلمانوں کے اندر حضورؐ کی حیثیت کا صحیح شعور نہ پایا جانا قابل فہم نہیں۔

مسلمانوں میں ایک بڑا طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ اللہ کے نبی معاشرے کے نیک لوگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضورؐ بھی بہت نیک آدمی تھے جو چودہ سو برس پہلے عرب میں ہوئے، اپنے زمانہ کی ضروریات کے مطابق انہوں نے معاشرتی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اس میں کامیابیاں حاصل کیں۔ ہمارے زمانہ کا معاشرہ کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے، لوگوں کے تصورات اور وقت کے تقاضے بہت کچھ بدل چکے ہیں۔ لہٰذا حضورؐ کی نیکی کے باعث آپ کے ساتھ عقیدت و احترام کا معاملہ تو ہونا چاہیے لیکن عملاً ان کے ہاں ہمارے لیے کچھ نہیں ہے۔

دوسرا طبقہ، جو یہ آگاہی رکھتا ہے کہ اللہ کے رسول خدا کا پیغام بندوں تک پہنچانے پر مامور ہوتے ہیں، اس تصور کا حامل ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیثیت وہی تھی جو ایک چٹھی رساں کی ہوتی ہے۔ آپ کو جو پیغام اللہ کی جانب سے ملا وہ آپ نے اپنے ماننے والوں تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد آپ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برا ہو گئے۔ آپ کے ماننے والے اب اپنے احوال کے لحاظ سے ان کے لائے ہوئے پیغام کے ساتھ جو معاملہ مناسب سمجھتے ہیں، اس کو اختیار کرنے میں آزاد ہیں۔

مسلمانوں کا ایک تیسرا طبقہ حضورؐ کے ساتھ محبت و عقیدت رکھتا ہے۔ ان کا تصور یہ ہے کہ حضورؐ کے اندر الوہی صفات تھیں، وہ بشریت سے اتنے بلند مقام پر فائز تھے کہ رب کائنات ہی کے ہم پلہ تھے اور تمام امور میں انہی کی رضا کے مطابق فیصلے ہوتے تھے۔ وہ اب بھی موجود اور دنیا میں تصرف کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طبقہ کو نبی اور رسول کی حیثیت کا کوئی شعور ہے اور نہ ان کے حقیقی فرائض سے کوئی لگاؤ ہے۔

چوتھا طبقہ خوش فہمیوں میں مبتلا ہے۔

ارباب تصوف کا طبقہ قرآن مجید کے علم کو ظاہری علم اور شریعت کو پھل کے ایک چھلکے کی طرح غیر اہم چیز قرار دیتا ہے۔ اس کے بالمقابل ان کے نزدیک اصل علم باطنی علم ہے جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا اور پھل کے مغز کی طرح اہم ہوتا ہے۔ یہ علم طریقت کہلاتا ہے جو کسی مرشد کا دامن تھامے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ مرشد اس طریقت کے رازوں کا امین ہوتا ہے۔ صوفیاء کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی کاوشیں جو قرآن کا علم پھیلانے کے لیے تھیں وہ عام لوگوں کے لیے تھیں، ورنہ علم حقیقی تو آپ نے چند مخصوص لوگوں کو ہی دیا جو نہایت رازداری سے اس کو اپنے متوسلین کو منتقل کرتے رہے۔ گویا جن ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی کھپا دی وہ صرف ایک بے مغز اور ضمنی سا کام تھا۔

مذکورہ بالا چاروں طبقات کا تصور رسالت قرآن سے بے خبری، رسول اللہؐ کی جدوجہد سے عدم واقفیت، حضورؐ سے اندھی بہری عقیدت، آپ کی محبت میں غلو، اور آپ کی حیثیت و فرائض کے بارے میں غلط قیاس آرائیوں پر مبنی ہے۔ جب بنیاد ہی غلط ہو جائے تو اس پر تعمیر کی جانے والی عمارت کیسے صحیح ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے فرائض اور ذمہ داریوں کو واضح کیا جائے۔

رسول اللہ کی منصبی ذمہ داریاں:

حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام نے جب اپنی نسل میں ایک عظیم رسول کی بعثت کی دعا کی تھی تو اس کی ذمہ داریاں بھی گنوا دی تھیں یعنی تلاوت آیات، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیہ نفوس۔ ان ذمہ داریوں کو جس عظیم شخصیت نے بھرپور انداز میں ادا کیا وہ محمد رسول اللہؐ کی واحد ذات پاک تھی۔ آپ پر جو آیات نازل ہوئیں انہی کا مجموعہ قرآن مجید ہے جس کی حیثیت وہی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب تورات اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی تعلیم انجیل کی تھی۔ یہ سب کتابیں آسمانی تھیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی ہدایت کے لیے مختلف ادوار میں نازل ہوئیں اور جن رسولوں پر نازل ہوئیں وہ اللہ تعالیٰ کے نظام نبوت کے تحت ایک ہی سلسلہ کے پیغمبر تھے جو آسمانی ہدایت کو لوگوں تک پہنچانے پر مامور ہوئے۔

تلاوت آیات:

تلاوت آیات کا مفہوم اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہونے والی آیات کو پڑھنا ہے۔ خود نبی ﷺ کے متعلق قرآن میں بیان ہوا ہے کہ آپ بعثت سے قبل نہ ان آیات کی تلاوت کرتے پائے گئے تھے اور نہ ان کو لکھتے لکھاتے تھے۔ بعثت کے بعد آپ یکا یک ان آیات سے واقف بھی ہو گئے اور اس تعلیم کو

لوگوں تک پہنچانے بھی گئے۔

رسول اللہؐ کی بعثت چونکہ امیوں میں ہوئی جس سے مراد بنی اسماعیل کے سوا کوئی نہیں، اس لیے آنحضرت ﷺ کی اصل ذمہ داری یتلوا علیهم آیاته یعنی ان کے سامنے آیات کو پڑھنا یا دوسرے الفاظ میں ان کو آیات سنانا تھی۔ چنانچہ مکہ میں اکابرین قریش کو قرآن سنانا اور اس کی تعلیم کو قبول کرنے کی دعوت دینا آپ کا معمول تھا۔ آپ مسجد حرام میں عین خانہ کعبہ کی دیواروں کے سایہ میں بلند آواز سے تلاوت فرماتے تا کہ قرآن کا پیغام قریش کے کانوں میں پڑ جائے۔ بعض لوگ آپ سے بحث میں الجھتے تو آپ ان کو بھی قرآن کی آیات سنا کر اس کی تعلیم سے آگاہ فرماتے۔ بعض لوگ یہ کلام سننے کی خود خواہش کرتے اور جن میں یہ جرأت نہ ہوتی کہ دوسرے لوگوں کے سامنے سنیں وہ اس وقت کی تلاش میں رہتے جب آپ رات کے وقت خانہ کعبہ کے پاس نماز ادا کرتے۔ یہ لوگ بیت اللہ کے غلاف کے پیچھے چھپ کر اپنی خواہش کو پورا کرتے۔

حضورؐ پر ایمان لانے والوں کے لیے قرآن مجید کا پڑھنا اور اس کو یاد کرنا از بس ضروری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعثت کے جلد بعد ہی اہل ایمان نے دار ارقم کو اپنی نشست و برخاست کا مرکز بنالیا اور رسول اللہ ﷺ سے استفادہ کی سبیل پیدا کی۔ یہ لوگ وہاں قرآن پڑھتے پڑھاتے، اس پر مذاکرہ کرتے اور اس کی روشنی میں اپنے عقائد و اعمال کی اصلاح کرتے۔ یہاں کی تربیت حاصل کرنے والی جماعت اسلام کی زبردست جانثار جماعت ثابت ہوئی اور وہ بھی تلاوت آیات کے کام میں حضورؐ کی شریک کار بن گئی۔

قریشی لیڈروں کو تلاوت آیات کے اس فریضہ سے بے حد وحشت ہوتی اور وہ کانوں پر کپڑے لپیٹ لیتے۔ حضرت ابوبکرؓ جب اپنے گھر کے صحن میں تلاوت کرتے تو بعض لوگ سننے کے لیے گوش بر آواز ہو جاتے۔ ان کے قرآن کی تعلیم سے متاثر ہونے کے خدشہ کے پیش نظر قریش نے حضرت ابوبکرؓ پر پابندیاں لگائیں کہ وہ گھر کے اندر یہ کلام پڑھا کریں۔

نبی ﷺ کو بھی قریش ٹوکتے کہ وہ اپنی دعوت پھیلانے سے باز رہیں تو آپ فرماتے کہ مجھے تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ 'ان اتلو القرآن' میں قرآن سناتا رہوں۔ جو شخص اس سے ہدایت پائے گا وہ خود اپنے فائدہ کے لیے ایسا کرے گا۔ لیکن قریشی لیڈر اگر قرآن سن بھی لیتے تو تکبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے سنی ان سنی کرتے اور اگر سننے کا اقرار کرتے تو کبھی اس کو سحر کہتے، کبھی پچھلی قوموں کے افسانوں کا ایک مجموعہ قرار دیتے۔ وہ اس کو اللہ کا کلام سمجھنے پر تیار نہ ہوتے۔

یہی رویہ مدینہ کے یہود نے روا رکھا۔ وہ قرآن سنتے تو اس کا انکار کرتے اور طرح طرح کے

اعتراضات کرتے، جبکہ وہ خود آسمانی کلام سے آگاہ اور اس کی بنیادی تعلیمات سے آگاہی رکھنے والے تھے۔ چنانچہ قرآن نے ان پر واضح کیا کہ جب اللہ کی آیات تمہیں سنائی جا رہی ہیں اور اس کے رسول تمہارے اندر موجود ہیں تو قرآن کے انکار کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔

حضورؐ نے اپنی اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے مدینہ میں بھی اصحاب صفہ کے ادارہ کی داغ بیل ڈالی اور حفاظ صحابہ طالبین کو قرآن سکھاتے۔ نمازوں کے اندر تلاوت کا حصہ شامل کرنے سے ہر مسلمان کو حفظ قرآن کی تحریک ملی۔ حضورؐ نے اس تحریک کو یہ فرما کر دوگونہ کر دیا کہ جس سینے میں قرآن کا کوئی حصہ محفوظ نہیں وہ ایک اجڑے گھر کی مانند ہے۔ حضورؐ رمضان المبارک میں کثرت سے تلاوت کرتے۔ وہی ذوق و شوق امت میں منتقل ہوا اور آج بھی دنیا کے ہر حصہ میں مسلمان تلاوت آیات کرتے اور قرآن حفظ کرنے کو سعادت کا کام سمجھتے ہیں۔

تعلیم کتاب:

رسولوں کے حوالہ سے کتاب کا ایک مفہوم وحی آسمانی اور اس پر مشتمل کتاب کا ہوتا ہے۔ قرآن کے بارے میں ہے ذلک الکتاب لا ریب فیه (یہ آسمانی کتاب ہے جس کے آسمانی کتاب ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں) کتاب کا دوسرا مفہوم قانون شریعت ہے۔ مثلاً فرمایا واولوا الارحام بعضهم اولی ببعض فی کتاب الله (اور قرابت دار اللہ کے قانون میں ایک دوسرے سے قریب تر ہیں) تعلیم سے مراد کسی کو بڑے اہتمام سے علم سکھانا ہوتا ہے۔ اس اہتمام کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی کتاب سنائی اور پڑھائی جائے تو اس کو ہر پہلو سے واضح کیا جائے، سننے والوں کے کچھ سوالات ہوں تو ان کو جواب مہیا کیے جائیں، ان کی جانب سے اعتراض پیدا ہو تو اس کو رفع کرنے کے لیے وضاحتیں پیش کی جائیں، اس کے اندر کچھ ایسے معانی مضمر ہوں جن کی طرف سرسری طور پر توجہ نہ ہوتی ہو تو ایسے معانی کھولے جائیں اور مخاطبین کو پوری طرح مطمئن کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اوپر نازل ہونے والی کتاب، یعنی قرآن مجید کی تعلیم میں یہ تمام باتیں ملحوظ رکھیں۔ احادیث میں بدوؤں کے سوالات اور آپ کے جوابات نقل ہوئے ہیں۔ اسی طرح مدینہ کے یہود آپ سے طرح طرح کی وضاحتیں طلب کرتے اور آپ نہایت خندہ پیشانی سے ان کو مطمئن کرتے۔ چونکہ سوال و جواب کی یہ عادت آدمی کی غلط تربیت بھی کر دیتی ہے اور وہ غیر ضروری سوالات کر کے معاملات کو مشکل بنا سکتا ہے۔ اس لیے جب اہل ایمان کی طرف سے کچھ نامناسب سوالات سامنے آئے تو قرآن نے ان کو اس سے روک دیا اور بتایا کہ قرآن کے نزول کے دوران اگر تم اس طرح کے سوالات کرو گے تو دین کو اپنے لیے مشکل بنا لو گے۔

وحی آسمانی کا ایک اہم حصہ شرعی احکام پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہود کی تمام اصولی شریعت تورات میں تھی جس پر اضافے ان کے فقہانے کیے۔ قرآن کے بیشتر احکام مدنی دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں ہیں۔ یہ بھی اصولی شریعت ہے۔ لہٰذا ان احکام کی وضاحت اور تبیین کرنا تعلیم کتاب کا تقاضا تھا جسے رسول اکرم ﷺ نے پورا فرمایا۔ آپ کو خاص نور عطا ہوا تھا جس کے باعث آپ کی روح بیدار تھی۔ اگر کسی معاملہ میں آپ کو وحی الٰہی کی رہنمائی نہ بھی حاصل ہوتی تو آپ اس نور کی مدد سے کوئی حکم دے دیتے۔ اس اعتبار سے آپ کی ذات معروف ومنکر میں شناخت کا سرچشمہ تھی۔

تعلیم کتاب کے اس فریضہ کو ادا کرتے ہوئے حضورؐ نے تمام عبادات و اصطلاحات ۔۔۔ صلوٰۃ، زکوٰۃ، روزہ، حج، طواف، قربانی، عمرہ، حدود حرم وغیرہ ۔۔۔ کی عملی شکل متعین فرمائی اور امت کو اس کی تربیت دی۔ اسی طرح احکام شرعیہ جو قرآن میں اصولی طور پر بیان ہوئے تھے آپ نے ان پر عمل کر کے ان کی تفصیلی شکل واضح فرمائی اور امت کو ان کا یہی قالب اختیار کرنے کا حکم دیا۔ اسی کا نام سنت رسول ہے یعنی رسول اللہؐ کا متعین کردہ وہ طریقہ جس کو اختیار کرنے کی حضورؐ نے امت کو تلقین فرمائی۔ اس طرح دین اسلام قرآن کریم کی اصولی تعلیمات اور سنت نبوی کی روشنی میں ان کی وضاحت دونوں کے مجموعہ سے متشکل ہوا ہے۔

علمائے امت نے رسول اللہؐ کے دیے ہوئے احکام کو تین قسموں میں شمار کیا ہے۔ ایک وہ احکام جو خود حضورؐ کی تصریح کے مطابق کتاب اللہ سے مستنبط ہیں حالانکہ ظاہر کتاب کی نص میں وہ موجود نہیں ہیں۔ دوسرے، وہ احکام جو مستنبط تو کتاب اللہ ہی سے ہیں لیکن حضورؐ نے اس بات کی صراحت نہیں فرمائی۔ تیسرے، وہ احکام جن کے حق میں قرآن میں کوئی نص وارد نہیں البتہ قرآن اس اضافہ کا متحمل ہے۔ گویا پہلی دو شکلیں فریضہ تبیین کے تحت آتی ہیں جبکہ تیسری شکل اس نور کا نتیجہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کا سینہ مبارک بھر دیا تھا۔

تعلیم کتاب کے فریضہ کو ادا کرتے ہوئے حضورؐ نے امت کو جس طرح دین سکھایا وہ رہتی دنیا تک دین اسلام کا قالب ہے۔ جو شخص اسلام قبول کرے وہ اپنی عملی زندگی میں اس کے کسی حصہ سے پہلو تہی یا اس کا انکار کر کے مسلمان نہیں رہ سکتا، خواہ وہ حضورؐ کے ساتھ کتنی ہی عقیدت کا اظہار کرے۔

تعلیم حکمت:

حکمت سے مراد عقل و دانش کی وہ پختگی ہے جس سے صحیح فکر اور صحیح عمل وجود میں آتا ہے۔ آسمانی ہدایت میں جس طرح احکام شریعت دیے جاتے ہیں اسی طرح اس میں زندگی کا صحیح فلسفہ اور ہر

ضروری معاملہ میں درست فکر بھی واضح کی جاتی ہے۔ اس ہدایت کو قبول کرنے والا شخص زندگی کے تمام مسائل میں صحیح سوچ اختیار کرتا اور اس کی روشنی میں اقدام کرتا ہے۔ حکمت اللہ تعالیٰ کا ایک عطیہ ہے اور نبی ﷺ کو اس کا معلم بنایا گیا۔ آپ نے اس حوالہ سے اپنی حیثیت یوں بیان فرمائی کہ انما انا قاسم والمعطی ھو اللہ، میں تو تقسیم کنندہ ہوں، عطا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ حکمت کی تعلیم کا طریقہ عقلوں کی تربیت اور کردار کی تعمیر ہے، کسی کو حکمت منتقل کرنے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کی بکثرت مشق کرائی جائے۔ فہم کے لیے روشنی مہیا کی جائے اور غور و فکر اور تعقل و تدبر کی عادت ڈالی جائے۔ اس معاملہ میں حکمت کا سب سے بڑا خزانہ کتاب اللہ ہے جو ان چیزوں کو متعین کر کے بتا دیتا ہے جو حکمت پر مبنی ہیں اور جن کو اختیار کر کے آدمی حکیم بن جاتا ہے۔ ان میں بنیادی چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف وہ توجہ ہے جو خشیت، محبت اور عاجزی کے ساتھ ہو۔ دوسری چیز لوگوں کے ساتھ رحمت، شفقت کا سلوک اور ان کی خیر خواہی ہے۔ علاوہ ازیں قرآن مجید نے دین کے تمام اصولی احکام کو بھی حکمت قرار دیا ہے۔ نبی ﷺ نے ان میں سے ہر چیز پر عمل کے صحیح اسلوب واضح فرمائے۔

رسول اللہ ﷺ قرآن پر غور و فکر اور تدبر کی تربیت فرماتے۔ صحابہ کرام کی مجالس میں ان سے ایسے سوالات کرتے جن سے وہ سوچنے پر مجبور ہوں اور ان میں قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ مثال کے طور پر آپ نے ایک مرتبہ صحابہ سے پوچھا کہ وہ کون سا درخت ہے جو ایک بندۂ مومن کی طرح ہے۔ لوگ صحرا کے درختوں پر غور کرنے لگے لیکن آپ نے فرمایا کہ کھجور کا درخت ایک مومن کی مثال ہے۔ قرآن مجید میں کلمہ لا الہ الا اللہ کی تمثیل یوں بیان ہوئی ہے جیسے ایک نہایت بلند و بالا مثمر درخت ہو جس کی جڑیں زمین میں نہایت گہری اتری ہوئی ہوں اور وہ اللہ کی توفیق سے ہر وقت پھل دیتا ہو۔ ایک بندۂ مومن اسی کلمہ طیبہ پر ایمان رکھتا ہے، اس کے موقف میں ثبات ہوتا ہے، اس کے اعمال و اخلاق نہایت بلند اور بافیض ہوتے ہیں۔ گویا ایک مومن کی مشابہت کھجور کے درخت کے ساتھ بالکل واضح ہے۔

حضورؐ نے کئی چیزوں کی حکمت اسی طرح تمثیلات کی مدد سے سمجھائی، مثلاً آپ نے صحبت صالح کے فوائد عطر فروش کے پاس جانے اور بری صحبت کے نقصانات ایک لوہار کی بھٹی کے پاس بیٹھنے کے اثرات کی مدد سے سمجھائے۔ آپ کا طریقہ یہ تھا کہ جب مسجد میں تشریف لے جاتے اور دیکھتے کہ کچھ صحابہ مل کر دین کے مسائل پر غور کر رہے ہیں تو آپ ان کے پاس بیٹھ کر ان کی گفتگو میں حصہ لیتے اور مسائل کی تفہیم میں ان کی مدد فرماتے۔ کبھی کبھی بعض صحابہ کوئی ایسا سوال کر دیتے جس میں وہ قرآن کے بیانات کی حکمت سے آگاہ ہونا چاہتے تو حضورؐ ان کو تعلیم کا ایسا خلاصہ بتا دیتے، جس کو وہ گرہ کر لیتے تو وہ ہمیشہ کے

لیے ان کی رہنمائی کا باعث ہوتا۔ مثال کے طور پر ایک شخص نے آ کر پوچھا کہ مجھے وہ عمل بتا دیجیے جو مجھے جنت سے قریب اور دوزخ سے دور کر دے۔ آپ نے فرمایا تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ، نماز کا اہتمام کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور صلہ رحمی کرو۔ ایک شخص نے سوال کیا کہ مجھے دو لفظوں میں وہ تعلیم دے دیجیے جو میری نجات کے لیے کافی ہو تو آپ نے فرمایا قل امنت باللہ ثم استقم (تو یہ شہادت دے کہ میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر اس پر استقامت رکھ) بعض اوقات رسول اللہ ﷺ ایسے جملے ادا فرماتے جن میں دین کی حکمت ہوتی اور وہ اس قدر جامع اور خوب صورت ہوتے کہ زبانوں پر چڑھ جاتے۔ ایک شخص نے دین کی حقیقت جاننا چاہی تو آپ نے فرمایا الدین النصیحۃ دین خیر خواہی کا نام ہے۔ اس نے پوچھا کس کی؟ آپ نے فرمایا: اللہ کی، اس کے رسول کی اور مسلمانوں کے عوام و خواص کی خیر خواہی۔

رسول اللہؐ کے بہت سے تربیت یافتہ صحابہ بہت بڑے حکیم تھے۔ وہ جب مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے ذمہ دار بنائے گئے تو ان کے فیصلوں میں اس تعلیم حکمت کے اثرات صاف نظر آتے ہیں جو انہیں نبی ﷺ سے حاصل ہوئی۔ مثال کے طور پر حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے عہد خلافت میں جب یہ اعلان کیا کہ جو شخص زکوٰۃ دینے سے انکار کرے گا تو میں اس کے ساتھ قتال کروں گا یہاں تک کہ وہ بیت المال میں اپنی پوری زکوٰۃ جمع کرا دے۔ جب صحابہ نے مشورہ دیا کہ زکوٰۃ کے منکر یہ لوگ نماز پڑھنے کے لیے تیار ہیں، لہٰذا مصلحت کے تحت فی الوقت ان کے ساتھ رعایت کر دی جائے تو سیدنا ابوبکرؓ نے فرمایا کہ قرآن نے نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ساتھ ساتھ کیا ہے لہٰذا میں ان دونوں میں تفریق نہیں کر سکتا۔ دونوں کے منکروں کے ساتھ یکساں سلوک ہوگا۔

تزکیہ نفوس:

رسول اللہ ﷺ کے تمام مذکورہ فرائض۔۔۔ تلاوت آیات، تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت۔۔۔ کا اصل مقصود تزکیہ نفوس ہے جو تمام انبیاء کی بعثت اور جدوجہد کا حقیقی مقصد ہوتا ہے۔ انبیاء کی جدوجہد کا اصلی ہدف ہر انسان اور ہر معاشرہ کا تزکیہ ہوتا ہے۔ آخرت میں نجات اور فلاح حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ انسان اپنا تزکیہ کرے۔ اس کے بغیر وہ جنت کی خواہش رکھتا ہو تو یہ ایک احمقانہ خواہش ہے۔ اس لیے تزکیہ ایک عام ضرورت کی چیز ہے۔ اس کے علم کو چند اشخاص تک محدود نہیں کیا گیا اور نہ اس کو راز بنایا گیا ہے۔ رسول اللہؐ اپنے تمام ساتھیوں کی تربیت فرماتے اور ان کے علم، اخلاق اور کردار کی تعمیر کے لیے ان کو لائحہ عمل دیتے۔ آپ صحابہ کرام کو اس بات کی تاکید فرماتے کہ وہ جو کچھ آپ کی

صحبت میں سنیں اور دیکھیں، اس کو دوسروں تک پہنچائیں۔ آپ نے تمام اخلاقی و روحانی بیماریوں کی اصلیت واضح فرمائی اور ان کے علاج کا طریقہ بتایا۔

تزکیہ کا مفہوم کسی چیز کو صاف ستھرا بنانا، اس کو نشوونما دینا اور اس کو پروان چڑھانا ہے۔ تزکیہ نفس کا مفہوم یہ ہے کہ نفس کے اندر جو غلط افکار و نظریات جڑ پکڑ گئے ہوں ان کی جڑیں اکھاڑ دی جائیں، عادات و اخلاق کی جو ناہمواریاں اور کمزوریاں اس کے اندر پیدا ہو گئی ہوں ان کو درست اور ہموار کیا جائے۔ فانی اور نفسانی لذتوں کی دلدل سے آدمی کو نکالا جائے اور اس کے رجحانات کو تبدیل کر کے اس کو نیکی اور خدا ترسی کے راستہ پر ڈال دیا جائے۔ انسان کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ نیکی اور بدی کی کشمکش میں نیکی کا ساتھ دے اور اس کو بدی پر غالب کرنے کی کوشش کرے۔

تزکیہ ایک وسیع الاطراف عمل ہے۔ اس میں زندگی کا ہر پہلو، خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی، عقلی ہو یا عملی، اخلاقی ہو یا اجتماعی و سیاسی، زیر بحث آتا ہے۔ اس میں اس بات کی تربیت ہوتی ہے کہ انسان کا رویہ صحیح علم پر مبنی ہو۔ وہ ایسے کام کرے جن سے اس کو اپنے پروردگار کا قرب حاصل ہو سکے۔ اور دوسرے انسانوں کے حقوق ادا کرنے کے قابل ہو۔ اس میں معاملات کی اصلاح اور کنبہ، خاندان، معاشرہ اور قوم سب کے ساتھ درست نہج پر تعلقات کی تعمیر کا طریقہ بتایا جاتا ہے۔ تزکیہ کے عمل سے نکلنے کے بعد ایک انسان کامل وجود میں آتا ہے اور پیغمبر اسی طرح کے انسان کامل تیار کرتے ہیں جن کے دم قدم سے یہ زمین قائم ہے۔

رسول اللہؐ کے بنیادی فرائض یہی ہیں جن کو آپ نے بدرجہ اتم پورا فرمایا اور ان کو امت میں رائج کیا۔ دوسرے فرائض مثلاً تبلیغ دین، انذار اور تبشیر انہی سے پھوٹتے ہیں اور ان کا زیادہ تعلق طریق کار سے ہے۔ امت مسلمہ نے رسول اللہ ﷺ کے دیے ہوئے اس خزانہ کی حفاظت اپنی جانوں سے بڑھ کر کی اور آج بھی ہر طالب اس خزانہ سے متمتع ہو سکتا ہے۔ جب اس حقیقت کو مدنظر رکھا جائے کہ رسول اللہؐ خدا کے آخری نبی ہیں اور قرآن قیام قیامت تک باقی رہنے والی آسمانی کتاب ہے جس کی شرح سنت نبوی کی شکل میں امت مسلمہ کے عمل میں پیوست ہے تو امت کے مختلف طبقات کے وہ رویے، جن کا ذکر اوپر ہوا، کسی پہلو سے درست نظر نہیں آتے۔ یہ نہ تو رسول اللہؐ کی حیثیت عرفی کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں اور نہ آسمانی ہدایت کو وہ مقام دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے نظام کے اندر فی الواقع اس کا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی

نیکی کی راہ سے شیطان کا حملہ

سوال: اگر دل ایمان سے معمور ہو تو انسان شیطان سے محفوظ رہتا ہے۔ کیا آدم علیہ السلام کے ایمان میں کوئی کمی تھی جو وہ شیطان کے چکمے میں آ گئے۔

جواب: اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دل ایمان سے معمور ہو تو انسان شیطان کے حملوں سے محفوظ رہتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے کسی برائی میں پڑ جانے کا امکان رہتا ہے۔ شیطان تو نیکی کی راہ میں بھی دھوکا دے سکتا ہے۔ یہ بات یاد رکھیں کہ حضرت آدمؑ نے اور دوسرے انبیاء علیہ السلام جتنے بھی ہیں انہوں نے نفس کی جانب داری میں کبھی دھوکا نہیں کھایا لیکن کسی نیکی کے معاملہ میں اعتدال و میانہ روی کا جو راستہ ہے اس میں کبھی کبھی وہ حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ آخر آنحضرت ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ نے تنبیہ کی کہ تم شیاطین قریش کے ایمان کی فکر میں اپنے ان نیک ساتھیوں سے، جو اللہ تعالیٰ کی خشیت رکھنے والے ہیں، غافل کیوں ہوتے۔ ظاہر ہے کہ پیغمبر ﷺ کا جذبہ تو نیکی کا تھا کہ شاید یہ سرداران قریش ایمان لے آئیں لیکن پیغمبر چونکہ حق کی کسوٹی اور معیار ہوتا ہے تو اس معاملہ میں بھی اگر حضورؐ حد سے آگے بڑھ گئے تو اس پر آپ کو ٹوکا گیا۔ حضرت آدمؑ نے جو مار کھائی تو جانب نفس سے نہیں کھائی، یہ نہیں کہ ان کو کوئی رشوت پیش کی گئی ہو، انہوں نے جو مار کھائی تو اس جائز خواہش پر کہ میں جنت میں ہمیشہ رہوں۔ اسی طریقہ سے نیک لوگوں سے نیکی کی راہ میں حد سے تجاوز ہو سکتا ہے۔ فرض کر لیجیے کہ ایک شخص روزہ ہی کے متعلق یہ ارادہ کر لیتا ہے کہ میں روزے رکھوں گا اور دھوپ میں بیٹھ کر اللہ کی عبادت کروں گا تو یہ نیکی کی راہ میں حد سے تجاوز ہے۔ اس طرح کے لوگوں سے نبی ﷺ نے فرمایا کہ تم مجھ سے زیادہ متقی نہیں بن سکتے، میں جو کچھ کرتا ہوں وہی تم بھی کرو۔ اگر قدم آگے بڑھاؤ گے اور قسط کا جو حکم ہے اس پر نہیں چلو گے تو مار کھاؤ گے، اس لیے کہ دین سے جو دھینگا مشتی کرتا ہے تو دین اس کو پچھاڑ دیتا ہے۔

نیکی کی راہ میں جو فتنے آتے ہیں میرا خیال ہے کہ اس پر بہت دلچسپ بحث غزالی نے کی ہے۔ بس اتنا یاد رکھیے کہ نیکی میں بھی قدم ہمیشہ جادۂ مستقیم پر رہیں، اپنی طرف سے نیکیاں نہ ایجاد کیجیے۔

روح اور نفس کا فرق:

سوال: روح اور نفس کا فرق سمجھنا چاہتا ہوں۔

جواب: آپ کا نفس ان تمام چیزوں کا مجموعہ ہے جن سے آپ کا وجود عبارت ہے۔ یعنی آپ کی مجموعی ذات آپ کا نفس ہے۔ روح اس کے اندر دو قسم کی ہے۔ ایک نسمہ ہے اور ایک روح ملکوتی یعنی Divine spark ہے۔ آپ کے وجود کے اندر جو زندگی ہے اور جو آپ کی گردش خون سے پیدا ہوتی ہے یہ نسمہ ہے۔ اس کو بھی عام اصطلاح میں روح کہتے ہیں لیکن اصل لفظ اس کے لیے جان کا ہے۔ دوسری قسم کو روح ملکوتی کہتے ہیں۔ میرے پاس وہ سائنس نہیں کہ جس سے میں نشاندہی کروں کہ یہ روح فلاں جگہ مقیم ہے لیکن یہ ہمارے اندر موجود ہے۔ اور وہ اپنا عمل کرتی ہے۔ یہ روح ہمیشہ غلط باتوں پر آپ کو ٹوکتی ہے۔ نیکی کے اشارے دیتی ہے۔ اگر آپ بالکل ہی لغو آدمی بن جاتے ہیں اور اس کو چپ کر دیتے ہیں تو وہ چپ ہو جاتی ہے اور وہ آپ کی ہلاکت کا وقت ہوتا ہے۔ اس روح کو سقراط اور ارسطو بھی مانتے ہیں۔ قرآن نے اس کے متعلق کہا ہے کہ روح اللہ تعالیٰ کا حکم ہے لیکن تمہیں تھوڑا ہی علم دیا گیا ہے لہٰذا ہر چیز کے درپے نہ ہوں۔

قدیم صحیفوں کے مطالعہ کا جواز:

سوال: حضرت عمرؓ کو آنحضرت ﷺ نے انجیل کا نسخہ پڑھتا ہوا دیکھ کر اس سے سختی سے منع کر دیا تھا اور فرمایا تھا کہ میرے بعد ایسی کسی چیز کی ضرورت نہیں رہی ہے، پھر آپ انجیل کا مطالعہ کیوں کرتے ہیں؟

جواب: آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ آنحضرت ﷺ نے حدیث کے لکھنے سے بھی منع کر دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن نازل ہو رہا تھا تو اس میں اشتباہ ہو سکتا تھا۔ خلط مبحث سے بچنے کے لیے حدیث کے لکھنے سے روک دیا گیا۔ بعد میں معلوم ہے کہ یہی کام مسلمانوں نے سب سے زیادہ سرگرمی سے کیا۔ یہاں تک کہ اس میں رطب کے ساتھ ساتھ یابس چیزیں بھی ملا دیں۔ اصل بات یہ ہے کہ نبی کے زمانے میں نبی ایک آفتاب ہوتا ہے اس کے سامنے چراغ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آفتاب کی روشنی میں اگر کوئی چراغ لے کر نکلے تو کہا جائے گا کہ اس کے دماغ میں کچھ خلل ہے۔ تو نبی ﷺ کے زمانے میں یہ ضرورت نہیں تھی کہ کوئی انجیل پڑھے۔ اب ہمارے لیے آفتاب کامل، قرآن موجود ہے۔ اب ساری دنیا کی باتیں، چاہے گمراہی کی ہوں چاہے ہدایت کی، آپ پڑھ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن کی کسوٹی پر پرکھے

بغیر کوئی چیز ہمارے ہاں قابل قبول نہیں ہوتی۔ ہمیں تو قدیم صحیفے اس لیے بھی پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ قرآن کے بہت سارے دعاوی میں کہ جن کے لیے ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآن نے عیسائیوں پر ایک الزام لگایا ہے تو اس کو ثابت کرنے کے لیے انجیل میں اس کی موجودگی کی دلیل ڈھونڈنی پڑتی ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ فلاں بات انہوں نے ایجاد کی تھی۔ ہمیں یہ تحقیق کرنی پڑتی ہے کہ انہوں نے کیا تحریف کی تھی۔ اب یہ زمانہ علم کا ہے۔ آپ اگر یہود و نصاریٰ پر تنقید کریں گے تو آپ کو براہ راست تورات و انجیل کا حوالہ دینا ہوگا۔ ہمارے ہاں تفسیروں میں یہ بات نہیں ہے۔ لیکن آپ میری میز پر دیکھیں تو انجیل کے نسخوں پر بھی میرے حاشیے اتنے ہی ہیں جتنے کہ قرآن پر ہیں۔ اس میں نوٹ ہے کہ یہ بات قرآن کے موافق ہے، یہ اس کے خلاف ہے، یہ تحریفات فلاں زمانہ کی ہیں، وغیرہ۔

آنحضرت ﷺ کے زمانے میں کسی کو انجیل پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں تک کہ حضرت مسیح علیہ السلام بھی اگر آجاتے تو وہ بھی اپنی امامت میں کسی کو نماز نہیں پڑھا سکتے تھے۔ حدیث میں فرمایا بھی ہے کہ حضور ہی کی اتباع ہر کوئی آنے والا کرتا۔ لیکن اب جتنا بھی کفر ہے اس پر تنقید کے لیے ان کا لٹریچر پڑھنا چاہیے، اتنا چھوئی موئی بن کر تو زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔

بدعتی امام کی اقتدا میں نماز:

سوال: ہمارے معاشرہ میں بدعت کی تعریف سے واقف ہوتے ہوئے بھی بدعت کی جا رہی ہے۔ یہ پریشانی ہوتی ہے کہ نماز جمعہ کہاں ادا کی جائے کیوں کہ حدیث سنی ہے کہ بدعتی کا ہر عمل مردود ہے اور بدعتی کے عمل کو دیکھ کر خاموش رہنے والا گونگا شیطان ہے۔

جواب: یہ بات صحیح نہیں ہے کہ بدعت کی تعریف سے سب لوگ واقف ہیں، بہت کم اہل علم ہیں کہ جو اس سے واقف ہیں۔ لیکن یہ مسئلہ الگ ہے۔

رہ گیا نماز وغیرہ میں کھلم کھلا بدعت تو واقعہ یہ ہے کہ احتیاط کرنی چاہیے۔ نماز بڑی قدر و قیمت رکھنے والی چیز ہے۔ جب آپ اپنی لڑکی کا ہاتھ کسی ایرے غیرے کے ہاتھ میں نہیں پکڑا دیتے تو اپنی نماز کس طرح ضائع کر سکتے ہیں۔ نماز جمعہ یا جتنی بھی نمازیں ہیں ان کے لیے مسجد وہ منتخب کیجئے جس سے آپ فی الجملہ مطمئن ہوں اور اس سے زیادہ کی توقع نہ رکھیے۔ امام صاحب کی بدعت معمولی ہو تو ان کے پیچھے نماز پڑھ لیجئے۔ ایسی صورت ہو تو میں تو یہ کہہ لیتا ہوں کہ ان کی بدعت ان کے ساتھ، میں اپنی نماز پڑھ رہا ہوں۔

آپ نے یہ جو سنا ہے کہ بدعتی کا ہر عمل مردود ہے تو واقعی اس کا ہر عمل مردود ہے۔ بدعتی کے عمل کو دیکھ کر جو خاموش رہنے والا ہے وہ گونگا شیطان ہے۔ لیکن گونگا شیطان وہ ہوتا ہے جو کسی غرض سے، کسی طمع سے، کسی دباؤ سے، کسی ڈر سے سچائی کا اظہار نہیں کرتا۔ اس کے منہ میں کوئی لقمہ دیا ہوا ہوتا ہے تو وہ چپ رہتا ہے لیکن جو آدمی عقل و ہوش رکھتا ہے وہ ہر وقت ہر کسی سے لڑائی کیسے کر سکتا ہے۔ آپ ناصح ہیں۔ آپ کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ جہاں دیکھیں کہ یہ نصیحت کا موقع نہیں ہے تو خواہ مخواہ کو خدائی فوجدار نہ بنیں۔ داعی کو دانشمند ہونا چاہیے۔ وہاں بات کرے جہاں سمجھتا ہے کہ کوئی سننے والا ہے اور کوئی نہیں سنتا تو لٹھ لے کر پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ارسٹوکریسی کی تربیت:

سوال: آپ نے کہا ہے کہ نظام حکومت کوئی بھی ہو اصل اقتدار ملک کی ارسٹوکریسی (Aristocracy) کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ ذرا اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: Aristocracy یا اعیانی حکومت سے متعلق جو کچھ میرے ذہن میں ہے اور جو میری رائے ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی نظام مطلق بادشاہت کی شکل میں یا صحیح قسم کی ڈیموکریسی کی شکل میں یا تھیوکریسی کی شکل میں کبھی بھی قائم نہیں ہوا۔ یہ بات واقعات کے خلاف ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا نظام قائم رہا ہے۔ ڈیموکریسی کی جو تعریف کی جاتی ہے کہ یہ عوام کی حکومت، عوام کے لئے، عوام کے ذریعہ سے ہوتی ہے تو یہ بھی قائم ہوئی ہی نہیں۔ اس بات کا خواہ مخواہ دعویٰ کیا جاتا ہے۔ رہ گئی بادشاہت تو فرعون سے بڑا کون بادشاہ گزرا ہے لیکن اس کی حکومت بھی اعیان ہی کی حکومت تھی۔ وہ انہی سے مشورے لیتا تھا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ سبا کی حکومت بھی اعیان ہی کی تھی۔ ملکہ اپنے اعیان سے مشورہ لیتی تھی۔ لہٰذا میرا نظریہ یہ ہے کہ نظام جو دنیا میں قائم ہوتا ہے اپنی حقیقت کے لحاظ سے واقعی ارسٹوکریسی ہوتا ہے یعنی اعیانی۔

اب سوال یہ ہے کہ ارسٹوکریسی کی بنیاد کن چیزوں پر ہو۔ پیدائش پر، Blood پر یا شرافت نسبی پر، جیسا کہ ہندوؤں کا فلسفہ تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ تو شیطنت ہے کہ جو برہما کے گھر سے پیدا ہوئے وہی حکومت کرتے ہیں باقی حکومت نہیں کرتے۔ افلاطون نے جو نظریہ پیش کیا ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ خیالی جنت ہے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ خیالی جنت ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ لوگ جو اہل الرائے ہوں، اہل استنباط ہوں کہ جن کے سامنے

معاملات پیش ہوں تو وہ ان کو سمجھ سکیں، ان کی تحقیق کر سکیں اور جس معاملہ میں صریح قانون نہ ہو اس کو اصل قانون سے مقابلہ کر کے معین کر سکیں، تو یہ لوگ حقیقی ارسٹوکریسی کے افراد ہوں گے۔ میرے نزدیک حضرت عمرؓ کی حکومت دنیا میں اس کی عملی مثال ہے، صحیح اعیانی حکومت ان کی رہی ہے۔ ان کے اعیان اہل الرائے اور اہل استنباط تھے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کی ارسٹوکریسی آج کہاں سے آئے گی تو میرے نزدیک حکومت کو اس کا انتظام کرنا پڑے گا۔ جس طریقہ سے سرکاری ملازمتوں کے لیے CSS اور PCS وغیرہ کے امتحانات ہوتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے آدمی انتظامیہ کے لیے تیار کیے جاتے ہیں اسی طریقہ سے تعلیم کے نظام کے ساتھ ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جو صرف ان لوگوں کو جو حکومت چلانے کے لیے منتخب ہوں تعلیم دے۔ اس لیے کہ ڈیموکریسی میں ایسے لوگ بھی منتخب ہو جاتے ہیں جنھیں حکومت کے الف ب کا بھی علم نہیں ہوتا اور میرا خیال ہے اس کی بہترین مثال ہماری حکومت ہے۔ وہ لوگ کہ جو اس بات کی اے، بی، سی بھی نہیں جانتے کہ پانی کہاں سے آتا ہے، نہریں کیسے بنتی ہیں اور کہاں پانی کی ضرورت ہے، ان لوگوں کے ہاتھوں میں پانی کے مسائل اور انتظام ہو تو یہ حماقت ہی ہے۔ آخر آپ لوگ یہ شور مچاتے ہو کہ ہر ایرے غیرے کو علاج نہیں کرنا چاہیے ورنہ مریض کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ڈاکٹر کا کم از کم M.B.B.S ہونا ضروری ہے اور طبی ڈگری کے بغیر کوئی علاج کرے تو اس پر مقدمہ چلنا چاہیے۔ میرے نزدیک حکومت چلانے کے لیے بھی آدمیوں کا امتیاز کرنا ضروری ہے۔ اس لیے یہ طے کرنا پڑے گا کہ کن معاملات میں رائے عامہ کی ضرورت ہے اور حکومت کے کن معاملات میں اعیان کی ضرورت ہے۔ فرض کر لیجیے کہ آپ ڈیموکریسی چلانا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ خلیفہ کو سب کا اعتماد حاصل ہو اور اس کا انتخاب رائے عامہ سے ہو لیکن وہ حکومت چلائے گا اعیان کے ذریعہ سے اور اعیان کے انتخاب میں صرف وہی لوگ کھڑے ہوں گے جو وہ ڈگری رکھتے ہوں جس کی نشاندہی میں نے کی ہے۔ یہ کام آپ کو مشکل نظر آئے گا لیکن عملاً یہی ممکن ہے اور آپ کو کرنا پڑے گا، اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ میرا یہ تصور بہت زیادہ تفصیلی بحث کا محتاج ہے۔ اگر مجھے موقع ملے گا اور مجھ سے مشورہ کیا گیا تو میں بتاؤں گا کہ طریقہ کار کیا ہونا چاہیے۔

ابن خلدون کا فلسفہ تاریخ:

سوال: ابن خلدون کے فلسفہ تاریخ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ابن خلدون کا فلسفہ تاریخ اسی طریقہ سے ہے جس طریقہ سے ڈارون کا نظریہ تخلیق اپنی جگہ پر

ہے۔ ڈارون کا نظریہ بجائے خود غلط نہیں ہے لیکن اس کی تقریر ایسی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور بالاتر مصرف باقی نہیں رہا اور ارتقا خود بخود ہو رہا ہے۔ اسی طرح ابن خلدون نے جو عصبیت کا فلسفہ پیش کیا ہے وہ بجائے خود ٹھیک ہے، عصبیت کے بغیر کچھ نہیں ہوتا، عصبیت ہی اجتماعی زندگی کی بنیادی اینٹ ہے۔ لیکن میرے نزدیک وہ عصبیت سے آگے اس تصور سے آشنا نہیں ہوا جو تصور کہ اسلامی عصبیت نے دیا ہے۔ اس کا فلسفہ عقیدہ اور ایمان کی وضاحت نہیں کرتا۔ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اسلامی عصبیت جس پر خلافت ارضی کا تصور قائم ہوتا ہے اس سے وہ واقف ہے۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ میں ابن خلدون کے فلسفہ کا ایک مدت دراز تک استاد رہا ہوں اور یہ بات بھی ہے کہ اس کی زبان سے مجھے دلچسپی رہی ہے، وہ عربی بہت اچھی لکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فلسفہ جتنا اس نے دیا ہے، یہ دوسرے فلاسفہ بھی جانتے تھے، یہ اس کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ امتیاز تو جب ہوتا کہ وہ اسلامی عصبیت کی وضاحت کرتا، جو اس نے نہیں کی ہے۔

داڑھی رکھنے کی اہمیت:

سوال: دیوبندی حضرات کے نزدیک ہر مسلمان کے لیے داڑھی رکھنا واجب ہے۔ لیکن بعض لوگ داڑھی رکھ لیتے ہیں لیکن اس کے لوازم کا لحاظ نہیں کرتے۔ ان کی غیر شریفانہ حرکات کے باعث قابل احترام باریش حضرات بھی خواہ مخواہ بدنام ہوتے ہیں۔ ان حالات میں داڑھی رکھنا کیا پھر بھی واجب ہے یا پھر صالح کردار والے لوگوں کو ہی داڑھی رکھنا چاہیے۔

جواب: یہ واقعہ ہے کہ داڑھی رکھنے والوں میں بہت سے احمق بھی ہوتے ہیں اور نالائق بھی۔ لیکن کیا ان کی نالائقی کی وجہ سے ہم اپنی داڑھی منڈوا دیں؟ اصل میں داڑھی کی اہمیت یہ ہے کہ یہ نبی ﷺ کا فیشن ہے۔ فیشن بڑی حساس چیز ہوتی ہے اور ہمیں بہرحال نبی ﷺ کے فیشن کی پیروی کرنی ہے۔ جو چیز نبی ﷺ نے عرب کی روایات کے تحت اختیار کیے رکھی اس کے تو ہم پابند نہیں کیے گئے، ہم اپنے معروف میں آزاد ہیں، لیکن جو چیزیں آپ نے اپنے فیشن کا حصہ بنا دیں، ان کو نمایاں حیثیت دے دی تو ان کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ اگر دیوبندی حضرات داڑھی رکھنے کو واجب کہتے ہیں تو میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ ویسے میں اپنے دوستوں کو کچھ نہیں کہتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے نزدیک داڑھی اندر سے اگنی چاہیے۔ یہ میرا کام نہیں ہے کہ میں باہر سے اس کو اگانے کی کوشش کروں۔ میں تعلیم دیتا رہتا ہوں، بتاتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ داڑھی اندر سے اگے۔ اگر میں اگانے کی کوشش کروں تو یہ مصنوعی داڑھی ہوگی جو میں لگانا نہیں چاہتا۔

شوہر اور بیوی میں ان بن:

سوال: اگر بیوی خاوند کے معاملہ میں نافرمانی کرے اور صرف بیوی کی وجہ سے سب بچے بھی سرکش ہو جائیں اور عمر کا تقاضا یہ ہو کہ اگر انسان بیوی کو طلاق دے تو تمام خاندان میں آنکھ نہ اٹھا سکے اور گھر میں رہے تو ایک سربراہ کی حیثیت نہیں رہتی، نہ بچے کہنے میں نہ بیوی، بلکہ صرف ماں کی غلط تربیت کی وجہ سے بچے باپ کے سامنے مرنے مارنے سے گریز نہیں کرتے تو ان حالات کے پیش نظر مجھے فتویٰ دیجئے کہ بیوی بچوں کے لیے کیا اقدام کرنا چاہیے؟

جواب: میرا خیال یہ ہے کہ فتویٰ دینے کے لیے وہ شخص موزوں نہیں ہو سکتا جو سائل سے واقف نہیں، اس کا پڑوسی نہیں، اس کے مزاج سے واقف نہیں۔ یہ صرف یک طرفہ بیان ہے۔ یک طرفہ بیان پر وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس صورت حال میں بیوی کا بیان بھی معلوم ہونا چاہیے کہ بوڑھے صاحب سلیقہ مند آدمی ہیں بھی کہ نہیں، انہیں معاملات کا فہم بھی ہے کہ نہیں، قوت برداشت بھی ہے یا نہیں ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ ساری زندگی انگھیلیاں کرتے رہے لیکن اس عمر میں مرشد اور مصلح بننے کا حوصلہ ہو گیا ہو۔ بہت سی باتیں ہوتی ہیں جن کا جاننا ضروری ہے۔ اس لیے آپ کو چاہیے کہ اس معاملہ میں کسی ایسے آدمی سے مشورہ لیں جو آپ کے دہنے بائیں رہتا ہو۔ جو آپ کو اچھی طرح جانتا ہو۔ آدمی سمجھ دار ہو گا تو آپ کی اس مشکل میں رہنمائی کرے گا۔ یہ مشورہ کا معاملہ ہے، رہا فتویٰ تو اس معاملہ میں فتوے کی تیغ آپ کے کام نہیں آ سکتی۔ اس سے آپ کا بھلا نہیں ہو گا۔ اس صورت حال میں بچے بھی ہیں اور بیوی بھی تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایسی بیوی کا تو بہر حال مرید ہی بن کر رہنا پڑتا ہے، اس کی خوشامد ہی میں فلاح ہے۔ بہر حال میری رائے یہ ہے کہ کسی سمجھ دار آدمی سے جو آپ کے حالات سے آگاہ ہو، مشورہ کر لیں۔

(ترتیب: سید اسحاق علی)

نشر اشاعت

تفسیر قرآن کے اصول

تالیف امام حمید الدین فراہی — ترجمہ و ترتیب خالد مسعود

موضوعات

1- قرآن میں تدبر و تفکر کی اہمیت
2- قرآن مجید کی ترتیب
3- قرآن ایک مربوط و منظم کتاب
4- اصول تفسیر کو مدون کرنے کی ضرورت
5- اصول تفسیر سے متعلق چند تمہیدی مباحث
6- تفسیر قرآن کے اصول
7- اصول تاویل

قیمت -/80 روپے

اصول فہم قرآن

مصنف: مولانا امین احسن اصلاحی — ترتیب: عبداللہ غلام احمد

موضوعات

- فہم قرآن کے لیے چند بنیادی اصول
  1- [illegible]
  2- [illegible]
  3- [illegible]
  4- [illegible]
  5- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

قیمت -/34 روپے

[illegible]

مصنف: [illegible]

- [illegible]
- عربی زبان کے قواعد کی تعلیم کا جدید انداز
- اسم، فعل اور حرف کا ضروری تعارف
- ترجمے کے لیے مشقیں

قیمت -/36 روپے

"میرے نزدیک یہ کتاب طالبعلموں کے لئے کافی ہے۔ اس سے عربی زبان سیکھنے کی راہ باز ہو جائے گی" ۔ مولانا امین احسن اصلاحی

ملنے کا پتہ

1- ادارہ تدبر قرآن و حدیث، رحمان مارکیٹ مسلم کالونی [illegible] لاہور۔
2- دارالتذکیر، رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔